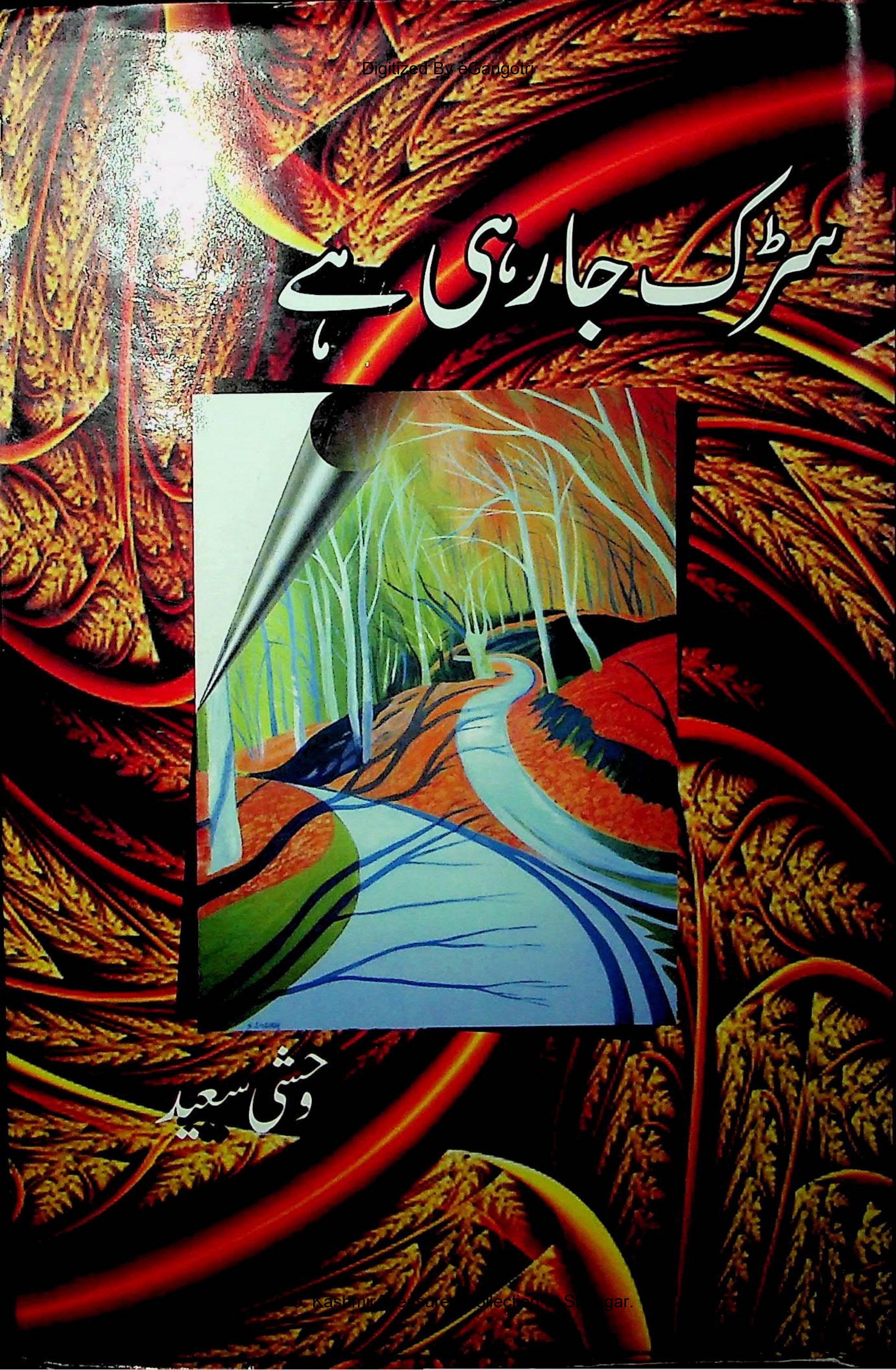

سڑک جا رہی ہے
وحشی سعید

Vehshi Syed

**Sadak Ja Rahi Hai**

(Short Stories)

نام کتاب: سڑک جارہی ہے

افسانہ نگار: وحشی سعید

سرورق: عظمیٰ اسکرین

ضخامت: ۱۶۸ صفحات

طباعت: مہاویر پریس، وارانسی

کمپوزنگ: عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837

e-mail: uzmascreen@gmail.com

سن اشاعت: جون ۲۰۱۴ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۲۰۰/روپے

تقسیم کار:

☆ Tahreek-e-Adab, Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata

Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 U.P.

Cell: 09935957330

☆ M. Syed Tramboo (Vehshi Syed)

Hotel Shahenshah Palace, Boulevard Road, Dal Gate

Srinagar-190001 (J&K)

Cell: 09419012800

# ترتیب

# سائے کی لاش

زندگی کے ارماں صلیب پر لٹکائے گئے۔ نازک دل کو شمشیر کی نوک پر اچھالا گیا۔

میں رو پڑا۔

زندگی کے تلخ تجربے بے حس بنا دیتے ہیں لیکن رقیہ بے حس نہیں تھی۔ وہ زندگی کی تیز اور گرم لہروں کی طرح پرجوش اور باہمت تھی۔ میں اس کے کتابی چہرے کے عکس جمیل میں کھو کے رہ جاتا۔ رقیہ کی آنکھوں میں شوخی اور ہونٹوں پر دل فریب تبسم رہتا تھا۔ وہ تبسم میری زندگی کا انمول سرمایہ بن گیا۔

پھر رقیہ میری تصاویر کا مرکز بن گئی۔ میں کیا کرتا؟ میرا قصور نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں میرے کاغذ پر رقیہ کا ہی پرتو ابھرتا۔ میں حیران و پریشان ہو کر اسے درست کرنے لگ جاتا۔ لیکن کوئی نہ کوئی خامی پھر بھی رہ جاتی۔

وہ کہتی۔

''کیوں ضائع کرتے ہو وقت۔''

''میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ ایک دن بہت خوبصورت تصویر بناؤں گا۔''

وہ چونک پڑتی۔

''کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔''

''تم خوبصورت ہو، بہت خوبصورت ہو۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے گلے لگاتے ہوئے کہتی۔

''میرے پیارے۔''

رقیہ اچھی تھی، بہت اچھی تھی۔ مگر جس دن اس کی منگنی ہوئی، وہ بے حس ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے وہ شوخ چمک غائب ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں کا وہ دلفریب تبسم کسی اندھیر غار میں دفن ہوگیا۔

''تم رو رہی ہو۔''

''شاید تم دل کے درد کو نہیں سمجھ سکتے۔''

شہنائی بجی۔ رقیہ مجھ سے بہت دور چلی گئی۔ ارمان صلیب پر چڑھائے گئے۔

میں اس وقت سات سال کا تھا۔

میرے بوقلموں نے وقت کی رفتار پکڑی۔ رنگ برنگ خاکے سج گئے مگر کوئی حسین چہرہ نہ ابھرا۔ نہ جانے کیوں میری ٹیڑھی لکیر خوشنما پھول کو جنم نہ دے پائی۔

ان دنوں مجھ پر وارفتگی نازل ہوئی۔ پھر خود کو جمود کی سل کے نیچے پستا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وقت بھاگتا رہا اور بھاگتے ہوئے اس نے اچانک میرے ہاتھوں میں ایک حسین تصویر سونپ دی۔ وہ تصویر بے حس تھی۔

میرے سامنے والے مکان میں وہ لوگ ہنستے ہنستے آئے تھے۔ نئے کرایہ دار تھے، اپنی کھڑکی پر وہ ہر وقت کوئی موٹا سا ناول لے کے بیٹھ جاتی۔ اور میرا بوقلموں اس کی الٹی سیدھی تصویر بنا دیتا۔

اس کا نام زرینہ تھا۔ لیکن میں اس کو 'زینو' کہتا تھا۔ گھریلو تعلقات نے 'زینو' کو میرے قریب کردیا۔ وہ میری بے حس تصویروں کو سراہتی۔ جیسے اس میں اپنی زندگی تلاش کرتی ہو۔

''میری ایک تصویر بناؤ۔''

میں ہنس کر کہتا۔

''مجھے اچھی تصویر بنانی نہیں آتی۔''

[illegible] جاتی۔
[illegible] تصویر بناؤ جس میں مجھے مریضوں کے درمیان ڈاکٹری لباس میں

[illegible] ڈاکٹر [illegible]

[illegible] دبے پاؤں بھاگتا رہا۔ زرینہ اپنے خیالوں کے جھولے میں سنہرے خوابوں کو [illegible]۔ ایک دن ایک ڈاکٹر آ گیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ چلی گئی۔ جانے سے پہلے وہ میرے پاس آئی۔ اس نے کہا۔

"میں بہت خوش ہوں۔ زندگی بھر مجھے اس کا افسوس رہتا کہ میں ڈاکٹر نہ بن سکی۔ لیکن اب نہیں کیونکہ میں ایک ڈاکٹر کی بیوی بن گئی۔"

میری ایک اور تصویر ضائع ہو گئی۔ نازک دل کو شمشیر کی نوک پر اچھالا گیا۔

ان دنوں میں پچیس سال کا تھا۔

میں پھر تصویروں کی دنیا میں کھو گیا۔ جہاں صرف خوابوں میں پریاں آتی تھیں۔ وہاں رانی کیتکی آنکھوں میں بھبھوت لگا کے میرے پاس آتی۔ یہ خواب کاغذ کے صفحوں پر پھیلتے گئے لیکن ایک چہرے کو جنم نہ دے سکے۔

میں شہرت کے گہوارے میں دل کا سکون بھلا بیٹھا۔ لیکن جب تصویروں کی ایک نمائش میں ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میں دوڑا۔ وہ حسین تصویر تھی۔

نگار میری تصویروں میں کھو گئی۔

"پسند آئی تصویریں۔"

وہ داد دینے لگی۔

"بہت خوب..... بہت خوب۔ زندگی کو تصویروں میں سمو دیا ہے۔"

"شکریہ۔"

"میں بہت عرصے سے آپ کے فن کی پرستار ہوں۔"

میں بے اختیار کہہ اٹھا۔

"میں بھی تو بہت عرصے سے آپ کی تلاش میں تھا۔"

وہ مسکرائی۔اس مسکراہٹ میں رقیہ کے تبسم کی اٹھان بھری ہوئی تھی۔وہ مجھ سے ملتی رہی۔میری تصویروں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہی اور کبھی کبھی زرینہ کی طرح بے حس بھی ہوتی رہی۔میں نے فیصلہ کیا کہ ایک حسین تصویر کو جنم دوں گا، اسے ادھوری نہ رکھوں گا بلکہ مکمل منزل کو پار کر جاؤں گا۔اب مجھے ایک ہی منزل پار کرنی تھی۔

ایک دن نہ جانے کون سا جنون اور جوش میرے دل میں اتر آیا۔میں اس سے کہہ اٹھا۔

''نگار میں تم سے محبت کرتا ہوں۔تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ فوراً بول پڑی۔

''آپ تو بوڑھے ہو گئے ہیں۔''

اس دن پہلی بار مجھے یاد آیا کہ میں پچاس سال کا ہوں۔نہ جانے میں کیوں رو پڑا۔

# جمود کا جنازہ

جمود کا پیرہن چاک کرنے کی جدو جہد بڑی ہی دلفریب ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ ایک بے حس آدمی میں آپ حس واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمال کی زندگی پر بھی جمود چھا گیا۔ اس کی زندگی بھی بے حس ہو کے رہ گئی۔ وقت کی تند و تیز ہواؤں نے اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا۔ اگر آپ اس کو دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ایک مردہ ابھی ابھی قبر سے نکل کر آیا ہے۔ لمبوترے چہرے میں صرف ہڈیاں، جو شاید اس لیے باقی ہیں کہ جمال کی نشاندہی کریں۔ سوکھے ہونٹوں اور سوکھے بدن نے اسے ایک اچھا خاصا کارٹون بنا دیا۔ شاید اس لیے کہ اس کے بدن میں جمود نے زہر کا کام کیا۔ جمود موت کی علامت ہے، ایک ایسی علامت جو انسان کی نس نس سے خون کھینچ لیتی ہے۔

پرانے تقاضے دم توڑ رہے ہیں، نئی قدریں ان کی جگہ لے رہی ہیں۔ وقت ہر لمحہ نئی تبدیلیوں سے دو چار ہو رہا ہے۔ ایسے میں پچیس سال کے نوجوان کا جمود میں گرفتار ہونا ٹھیک نہیں۔

جمال نے جذبے کو قتل کیا، ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا۔ زندگی کے ساتھ یہ بے رخی جان لیوا ہوتی ہے۔ وہ میرا دوست تھا اور دوست کی زندگی کو میں اس طرح پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جمود کے ملبوسات ترک کر کے جذبے اور جدو جہد کا پیرہن پہن لینے کے لیے ہر وقت میں اس کو سمجھاتا رہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ جیسے ایک گوشت و پوشت کا آدمی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ میں اس سے کہتا۔

''تمہیں سب کچھ بھولنا ہوگا۔ نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔ ٹھنڈے جذبات کو گرمی کا احساس دلاؤ۔ زندگی کو محض مشت غبار تصور نہ کرو۔ جب تک اس دنیا میں رہو [illegible] تک زندگی کا بوجھ زندگی کے اصولوں پر اٹھاؤ۔ اس کے لیے خود کو بے حسی کے جال سے نکال [illegible] امنگوں کو اپنا رہبر بنا کر نئی زندگی کا آغاز کرو۔''

وہ میری طرف ایسے دیکھتا جیسے میں نے اسے خودکشی کا مشورہ دیا ہو۔ اس کی [illegible] مجھ سے صاف یہ کہتی ہوئی نظر آتیں۔

''تم حالات سے بے بہرہ تو نہیں ہو۔ پھر اس کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔''

ہاں! جمال کا ماضی بھیانک تھا۔ جس کو یاد کر کے میرے بدن میں بھی خوف کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کتنا درد و کرب اس کے دل میں چھپا ہوا تھا۔

رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں، یہ اندازہ تب ہوتا ہے جب انسان دھوکہ کھاتا ہے۔ ایک یتیم جو در بدر کی خاک چھانتا پھرے، یہ احساس ہو کہ کوئی اس کا دامن تھامنے والا نہیں۔ کس کو بھائی، بہن، دوست، ماں کہہ کر پکارے۔ ایسے رشتوں کی پیاس بڑی دردناک ہوتی ہے۔ جمال بھی اسی پیاس میں مبتلا رہا۔ اس کی زندگی بچپن سے اٹھارہ انیس سال کی عمر تک رشتوں کے بندھن سے آزاد تھی۔ اچانک رشتوں کی پیاس نے اس کے دماغ کو آ گھیرا۔ میں اس کا دوست تھا، جس نے ہر وقت اس کے چہرے پر بے فکری اور بے نیازی دیکھی۔ لیکن اس دن اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر میں نے کہا۔

''تم آج کل پریشان نظر آتے ہو۔''

''ہاں ہوں۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

''نہ جانے دماغ میں رہ رہ کر یہ خیال کیوں آتا ہے کہ میری بھی کوئی بہن ہو۔ لیکن کون بنے میری بہن!''

سوال تھا رشتہ قائم کرنے کا۔ آج کل کی دنیا میں رشتوں کی کیا کمی ہے۔ رشتے رشتوں پر قائم ہوتے ہیں۔ نفع اور نقصان پر بھی اور تجارت کے صرف و نحو پر بھی۔ بکنے والی اس دنیا میں ہر چیز بک جاتی ہے۔ ایک دن جمال کے گھر میں بھی ایک رشتے والی آ گئی۔ جمال نے

مجھ۔ ے مسرت [illegible] کر کہا۔

"[illegible] خوش ہوں۔"

"[illegible] تمہارے چہرے پر یہ رونق کیسے آگئی۔"

"[illegible] پیارے دوست مجھے بہن مل گئی۔"

"[illegible]ی!"

ہاں، فٹ پاتھ پر مل گئی۔ وہ بھی میری طرح یتیم ہے، بے کس ہے، لاچار ہے۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا ہوں۔ گھر کا نظام اس کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے ایک بہن مل گئی۔"

میں واقعی خوش تھا کہ اس کی رونق واپس آ گئی۔ ایک بار وہ پھر پہلا سا جمال نظر آنے لگا۔ جس کے چہرے پر بے فکری، بے نیازی تھی۔ دنیا نے نہ جانے کیا کیا الف لیلیٰ کے قصے اس کے اور اس کی بہن کے رشتے سے وابستہ کیے۔ کوئی کہتا۔

"بہن کے پاک نام پر ایک گناہ ہو رہا ہے۔"

کوئی قہقہہ لگاتا۔ "بہن"

کوئی کہتا۔

"جمال کے بھولے پن میں بھی ایک بہت بڑا شیطان چھپا ہوا ہے۔"

دنیا حقیقت جاننے کی تڑپ کب رکھتی ہے۔ باتیں بنانے والے خود ہی تبصرے کرتے ہیں اور خود ہی تجزیہ کر کے فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمال نئی بہن کو پا کر ہر وقت مسرور نظر آتا تھا۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات پوری کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

وقت بدلنے میں کب دیر لگتی ہے۔ کئی رشتے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ شبنم نے کب رشتے سے انکار کیا تھا۔ جمال کو وہ چاہتی تھی لیکن چاہت کا رنگ جدا تھا۔ شبنم ایسے رشتے کی قائل نہیں تھی جو وقتی ہو۔ اور وقت کی تیز ہوا ان رشتوں کے درمیان خلیج پیدا کر دے۔ جب جمال نے ایک دن اس سے کہا۔

"میری بہن اب بہت جلد ہم ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ پھر میں تنہا رہ جاؤں گا، لیکن لڑکیاں تو ہوتی ہی ہیں پرائی۔ میں تمہاری شادی کسی اچھے گھرانے میں کر دوں گا۔

''شبنم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
''اتنی بھی کیا جلدی ہے؟''
''تمہیں پہلے جلدی نہ ہوتی۔ لیکن اب تمہارا بھائی آ گیا ہے۔ اسے [illegible] ہے۔ اس کو اپنا فرض نبھانا ہے۔''
''جمال آج تک تم ایک بات نہیں جان پائے۔ میں تمہیں پیار کرتی [illegible] سے دور نہیں رہ سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ رشتے ہم خود ہی بناتے ہیں، خود ہی ترتیب دیتے [illegible] میرے پاس ایک احساس ہے، ایک جذبہ ہے کہ تم ہی میرے جسم و روح کے مالک ہو۔ میرے خوابوں کے شہزادے ہو..... پھر کیوں نہ ہم دونوں شادی کر لیں۔''
جمال یہ سن کر مجسمے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم سے روح کھینچ لی ہو۔ یا کسی نے بری طرح اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہو۔ تھوڑی دیر اس کا ذہن نیک و بد خیالات کے درمیان ڈوبتا ابھرتا رہا۔ اس نے شبنم کو اسی فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا۔
جمال سوچتا رہا۔
''رشتے کتنے کچے ہوتے ہیں۔ رشتوں کے دھاگوں میں نفع و نقصان کی باتیں سوچی جاتی ہیں۔''
شبنم نے اسے بہت دکھ دیا تھا اور دکھوں نے اسے بے حس کر دیا تھا۔ کام سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ دنیا کے کاروبار سے بے زار ہو گیا۔ تمام دنیا اس کو بے حسی کی تصویر لگنے لگی۔ جہاں نہ رشتوں کی کوئی قیمت ہے نہ ہی انسانیت کا چراغ جلتا ہے۔
جمود نے اس کی زندگی میں زہر کا کام کیا۔ میں اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر کلیجہ تھام کے رہ جاتا ہوں۔ اکثر اس سے کہا ہوں۔
''نکال دو اس جمود کا جنازہ۔ زندگی سے کب تک یوں فرار رہو گے۔''
وہ میرا منہ خاموشی سے تکتا رہتا۔ پھر دھیمی آواز میں جواب دیتا۔
''جمود میری زندگی کا روگ بن گیا ہے۔ اس جمود کا جنازہ اب تو میری زندگی کے جنازے کے ساتھ ہی اٹھے گا۔''

سڑک جا رہی ہے

# جب وہ نغمہ چھیڑتی ہے

کچھ چیزیں یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ انسانی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی لاتی ہیں۔ ایسی تبدیلی جو زندگی میں نئی قسم کی ہلچل پیدا کر دے۔

رینو کا دیوی کی شاندار پارٹی سدھیر کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو ایک مالدار بیوہ، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ چند سال پہلے اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔ اس کو کوئی اولاد نہ تھی جو کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتی، اسے سنبھالتی۔ اس لیے سارا کاروبار اسی نے سنبھالا تھا۔ سدھیر اس کے کارخانے میں ملازم تھا۔ اس شاندار پارٹی میں اس کی مالکن نے اس کو شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ رینو کا دیوی کا ماضی کچھ روشن نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ آوارہ تھی لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ماضی کے داغوں کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن لوگ اس کے ماضی کو بھولنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بے تحاشہ دولت بھی لوگوں کے ذہنوں سے اس کا ماضی نہ نکال سکی۔ وہ رحم دل بھی تھی۔ سدھیر اس عورت کے بارے میں سوچتا کہ کیا کبھی اس رحم دل عورت نے ایسے دن بھی گذارے ہوں گے، جن کا تصور کر کے وہ کانپ اٹھتا تھا۔ ایک دن وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے خیالات ایک مدھر راگ نے منتشر کر دیے۔ یہ ایک دلفریب آواز تھی، ایسا نغمہ تھا جس سے وہ تھوڑی دیر کے لیے اردگرد کی دنیا کو بھول گیا۔ ایک حسین لڑکی جس کا ہاتھ تیزی سے پیانو پر چل رہا تھا۔ اس کی آواز میں لوچ اور ایسا اثر تھا جو نوجوان دلوں کو پگھلا دے۔ اس کے نغمے نے سدھیر کو ایسا سرور بخشا جس میں کھو کر ہوش پانے کی خواہش نہ ہو۔ وہ لڑکی کے جسم کے ہر تناؤ کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی ہر ادا میں جوانی کی بجلی چھپی تھی۔ اس کی مالکن نے پاس آتے ہوئے کہا۔

''سدھیر کیا دیکھتے ہو۔''

وہ قدرے گھبرا گیا۔ گھبراہٹ جس میں شرم وحیا کی جھلک تھی۔

''جی! کچھ نہیں۔''

رینوکا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نوجوان نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ آؤ میں تم کو اس لڑکی سے ملاؤں۔''

''شالنی اس سے ملو، یہ میرے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کا نام سدھیر ہے۔ تم دونوں باتیں کرو، میں دوسرے مہمانوں کو دیکھتی ہوں۔''

سدھیر کے ذہن میں آیا کہ رینوکا دیوی اس کی شفیق ماں ہے۔ سچ مچ وہ ایک فراخ دل عورت تھی۔ ایک ایسی عورت جس کے دل میں چھوٹے بڑے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے شالنی سے کہا۔

''آپ نے جو غزل گائی وہ سچ مچ دلوں پہ اثر کرتی ہے۔''

''شکریہ۔''

لڑکی کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ سدھیر سوچ رہا تھا کہ کہاں سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔ پارٹی اختتام پر تھی۔

''آپ کہاں رہتی ہیں۔''

''کمپنی باغ کے قریب۔''

''آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔''

''لیکن۔''

''آیئے نا۔''

وہ دونوں رینوکا دیوی سے اجازت لے کر ٹیکسی میں سوار ہوئے لیکن اس چھوٹے سفر میں خاموش رہے۔ شاید ڈرائیور کی موجودگی ان کو خاموش رہنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے چہرے کا حال پڑھ رہے تھے۔ کمپنی باغ کے پاس ٹیکسی رک گئی۔ دونوں نیچے اترے، سدھیر نے ٹیکسی والے کو پیسے دیے۔

شالنی نے ایک پرانے اور فرسودہ طرز کے مکان میں دو کمرے کرائے پر لیے تھے۔
صاف ظاہر تھا کہ وہ غریب تھی۔ جب وہ اپنے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچی، سدھیر
کہا۔

"مجھے اجازت دیجیے۔"

چاہتا تھا کہ پیار کے اظہار میں جلدی کرے۔ ممکن ہے شالنی بوکھلا اٹھے۔
اس کے قریب ہونا چاہتا تھا تا کہ اس کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ سکے۔ وہ من ہی من میں
نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اچانک شالنی نے کہا۔

"اندر آ جاؤ سدھیر۔"

اس آواز میں درد تھا ایک ایسا درد جس میں غربت کی تلخی موجود تھی۔

"میں جانتی ہوں سدھیر تم میرے اس چھوٹے سے کمرے میں آنا پسند نہیں
کرو گے۔ لیکن اس میں میرے ذوق انتخاب کا قصور نہیں۔ میں ایک غریب اور یتیم لڑکی ہوں۔
ایک جوتے کی دکان میں تین ہزار روپے کی معمولی تنخواہ پر ملازم ہوں۔"

سدھیر نے شالنی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"شالنی اگر انسان کو روٹی کے دو ٹکڑے عزت سے مل جائیں تو وہ اس دولت مند
آدمی سے بہتر ہے جو ناجائز طریقوں سے دولت کماتا ہے۔"

سدھیر اس کے کمرے میں داخل ہوا اور سوچنے لگا کہ یہ مفلس ضرور ہے لیکن صورت
اور سیرت کی دولت سے مالا مال ہے۔ وہ اس کے دل میں سما گئی۔ اس کا سب کچھ ہو گئی۔ نہ
جانے اس کی نیلی آنکھوں میں کیا تھا کہ ان میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے چائے سدھیر کے
سامنے رکھی۔

"شالنی تم غریب ہو اور رینو کا دیوی بہت امیر۔ پھر اس کا اور تمہارا کیا سمبندھ ہے۔
یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔"

شالنی نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔

"رینو کا دیوی ایک رحم دل عورت ہیں۔ ایک دن جوتے کی دکان پر سینڈل خریدنے

کے لیے آئیں، جہاں میں کام کرتی ہوں۔ میں ان کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آئی۔ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا سیلز گرل کا پیشہ ہی ہے۔ وہ میرے سلوک سے متاثر ہوئیں۔ اور آج مجھے دعوت پر بلایا۔"

سدھیر نے چائے ختم کی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ دوبارہ کہاں ملاقات ہوگی۔"

شالنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کل نہیں...... پرسوں میں چھ بجے گھر پر ہی انتظار کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پرسوں ملنے آؤں گا۔"

"شب بخیر۔"

"شب بخیر۔"

پھر وہ اس کو ایک بار نہیں دس بار ملا۔ دس ملاقاتوں کے بعد وہ ایک پیار کا بوسہ حاصل کر سکا۔ وہ گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی شالنی کہتی۔

"سدھیر میں چاہتی ہوں کہ میرا ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا گھر ہو۔ میں ملک کے پر رونق شہروں کو، بمبئی کے میرین ڈرائیو کو، کلکتہ کے وکٹوریہ میموریل کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اس کے لیے دولت چاہیے۔"

سدھیر اس کو گلے لگا کر کہتا۔

"نہیں شالنی، غریب لوگ ایسے خواب نہیں دیکھتے۔ ایسے خواب سہی راستے سے بھٹکا دیتے ہیں۔"

لیکن شالنی میں یہ جنون کیونکر پیدا ہو گیا تھا۔ ایک شام جب سدھیر اپنی پیاری محبوبہ کے لبوں پر پیار کا بوسہ چسپا کر رہا تھا۔ اچانک شالنی کے بازو اس کے ارد گرد مضبوط ہوئے۔ سدھیر کے جذبات میں آگ لگ گئی۔ ایک ایسی آگ جس نے دونوں کو بہکا دیا۔ جب ہوش آیا، شالنی نے سدھیر سے کہا۔

"اب تم چلے جاؤ مجھے اکیلی چھوڑ دو۔"

سدھیر اس کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ شالنی کے چہرے پر نفرت کی لکیریں گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ سمجھ بیٹھا کہ شالنی اس سے بہت دور چلی [illegible] وہ [illegible] منزل کی آس لگا بیٹھا تھا اس نے سوچا کہ وہ منزل کھوگئی۔ لیکن یہ اندازہ غلط [illegible] دن جب وہ اس سے ملنے گیا، وہ گرم جوشی سے ملی کہ جیسے کل کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ [illegible] تھے، جوان دل رکھتے تھے۔ کئی بار وہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہوئے لیکن ہر بار [illegible] کے [illegible]رے پر ان واقعات کے بعد نفرت کی لکیریں گہری ہو جاتیں۔ شاید اس کو یہ سب شادی سے پہلے پسند نہ تھا۔ شاید وہ اپنے محبوب سے قانونی اور سماجی بندھنوں سے پہلے ایسے تعلقات نہیں بنانا چاہتی تھی۔ سدھیر اس کی یہ حالت دیکھ کر گہری سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا۔

''شالنی ہم دونوں کو شادی کر لینی چاہیے۔''

سدھیر کا خیال تھا کہ شالنی یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے گی۔ لیکن ........

''مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔''

سدھیر حیرت میں تھا کہ وہ آخر کیا سوچنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن جب اس سے ملنے گیا تو اس فرسودہ مکان کے دونوں کمرے خالی تھے۔

''کہاں چلی گئی۔'' وہ خود سے پوچھتا رہا۔ اس جوتے کی دکان میں بھی گیا، جہاں شالنی کام کرتی تھی۔ اس نے وہ نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔

''کیا آپ کو معلوم ہے شالنی کہاں گئی۔''

رینو کا دیوی نے جواب دیا کہ اس کو شالنی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

وہ زندگی سے مایوس ہو گیا۔ ایک دن اچانک اس کو شالنی کا مکان مالک ملا۔

''تم لڑکی کو ڈھونڈ رہے ہو نا۔''

''ہاں۔''

''میرے خیال میں وہ گلاب باغ کے کسی مکان میں رہتی ہے۔''

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ سدھیر دوڑتا ہوا گلاب باغ پہنچ گیا۔ شالنی اب ایک اچھے

فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ حیران تھا۔

''شالنی......شالنی۔''

شالنی نے اس کو دیکھ کر حقارت سے کہا۔

''تم یہاں کیوں آئے۔ چلے جاؤ....میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔''

سدھیر نے سوچا شاید وہ روٹھ گئی ہے۔

''میری پیاری شالنی تم ناراض کیوں ہو۔ کیا بات ہے۔''

''چلے جاؤ سدھیر، بھول جاؤ سب کچھ۔ وہ دن جو ہم نے اکٹھے گذارے تھے، وہ تو ایک کھیل تھا جو ختم ہوا۔''

اچانک اس کی نظر شالنی کے پیٹ پر پڑی۔ وہ چیخ پڑا۔

''او، تم حاملہ ہو۔ اس لیے مجھ سے چھپتی رہی۔ لیکن پگلی تم نے مجھے غلط سمجھا۔ یہ میرا بچہ ہے۔ یہ ہمارا بچہ ہے۔''

شالنی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

''نہیں سدھیر یہ ہمارا بچہ نہیں ہے۔ یہ رینو کا دیوی کا بچہ ہے۔''

اس لمحے سدھیر کو شالنی کا وہ چہرہ یاد آیا جس میں نفرت کی لکیریں گہری ہو جاتی تھیں۔ وہ یہ کام رینو کا دیوی کے لیے کر رہی تھی۔

''تمہارا مطلب......''

''ہم دونوں غریب ہیں۔ میں دنیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان سب چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے دھن چاہیے۔ وہ دھن میں اس بچے سے حاصل کر سکتی ہوں۔ رینو کا دیوی کو ایک بچہ چاہیے۔ ماضی کی کرتوتوں نے اسے اس قدر بدنام کیا کہ کوئی بھی یتیم خانہ اسے بچہ دینے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے وہ میرا بچہ چاہتی ہے۔ اس نے ہم دونوں کو اسی لیے ملایا۔ بچے کے عوض بہت روپیہ ملے گا۔ میں فلیٹ بھی خرید سکتی ہوں۔ دنیا دیکھ سکتی ہوں۔''

یہ عورت ہے۔ یہ ماں......

نہیں یہ ماں نہیں ہے۔ یہ عورت نہیں ہے۔

یہ حسن کی پرستار ایک بے جان مورتی ہے۔

[illegible] اس کو سمجھاتا رہا، وہ نہ سمجھ سکی۔ اسے شالنی سے نفرت ہوگئی۔ لیکن ایک بار

[illegible] بچے کو [illegible] کی تمنا ضرور تھی۔ اس دن وہ اسپتال گیا۔

[illegible] نے بچے کو جنم دیا۔ لیکن وہ مردہ پیدا ہوا۔

[illegible] روپے حاصل نہ کر سکی۔ فلیٹ حاصل نہ کر سکی۔ وہ ممبئی، کلکتہ، دہلی نہ جا سکی۔

[illegible] سوچتا رہا۔

"شالنی اب کون سا نغمہ چھیڑے گی۔"

# ہنسی کا قتل

ماتھر زندگی کی بھول بھلیوں میں کھونے والا شخص نہیں تھا۔ سنجیدگی کبھی اس کی زندگی میں داخل نہ ہوئی تھی۔ وہ مذاق کو زندگی اور زندگی کو مذاق سمجھتا تھا۔ اور سنجیدگی کو موت تصور کرتا تھا۔ موت کو وہ دعوت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ زندگی اس کو پیاری تھی۔ وہ اسے کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔

اکثر لوگ ایسے لوگوں کی ذہنیت پر شک کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ صرف سنجیدہ قسم کے لوگ اپنے سامنے زندگی کا نصب العین رکھتے ہیں۔ زندگی کے اصول پر جیتے ہیں اور پھر کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن ماتھر غیر سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کا ایک نصب العین رکھتا تھا۔ احساس بھی رکھتا تھا اور فرض شناسی کا گہرا مادہ بھی لیکن اس قول پر ایمان کے ساتھ کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ الجھنوں میں آدمی گم ہو کے مزید الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ اور آخر کار مشین بن جاتا ہے۔ جو بے حس ہوتی ہیں۔ زندگی کے پتھر اور لوہے جیسے راستے کو طے کرنے کے لیے مضبوط کلیجہ چاہیے۔ نہ کہ نڈھال جسم جو کہ چہرے کے بوجھ کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن ماتھر کے پاس بھی بوجھ تھا۔ اس کی بہن........جوان اور کنواری، جس نے زندگی کے سولہ سال طے کیے تھے لیکن وقت سے زیادہ جوان دکھتی تھی۔ بڑے بڑے اعضاء، لمبا قد، دلکش چہرہ۔ وہ بھی اس بوجھ سے غافل نہیں تھا۔ پریشان بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر کام وقت پر ہوگا اور ہر کام کا اپنا وقت ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے کوئی کام نہیں ہوتا۔

جب وہ بی اے میں تھا، اس کا والد زندہ تھا۔ ماں پہلے ہی عالم ارواح چلی گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد والد بیمار ہوئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ اپنی [illegible] کی زندگی کو آرام و آسائش سے بھر دے گا۔ اس کی شادی کرے گا۔ اس کی زندگی کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ یہ [illegible] بوجھ [illegible] ہر وقت یاد دلاتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

[illegible] درجہ کی زندگی، آٹھ دس ہزار کی آمدنی۔ اچھی زندگی کے لیے آٹھ دس ہزار [illegible] کم ہوتے ہیں۔

[illegible] بذات خود ایک بوجھ ہے۔ بوجھ پر بوجھ مشکل ہوتا ہے۔ آسان راہوں میں کانٹے پھیل جاتے ہیں۔ اس روگ کا ہنستے ہوئے مقابلہ کرنا دل گردے کا کام ہے۔ یا یوں کہیے کہ شان بے نیازی وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتی ہے یا وقت اس کو مسخرہ بنا دیتا ہے۔ لیکن وہ نہ تو وقت کے ساتھ مسخرہ بنا، نہ ہی اس میں شان بے نیازی پیدا ہوئی لیکن فرض کے احساس کا بوجھ ہر وقت موجود تھا۔ ان سب سوالوں کا اس کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا۔

''وقت پر سب کچھ ہوگا۔''

وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ جس کی تیز ہواؤں نے اس پر کوئی برا اثر نہیں ڈالا۔ وہ دفتر کی کلرکی تک محدود تھا۔ یہاں آشا، ریٹا اور اوشا تھیں جو دفتر کی جان تھیں۔ لیکن آشا کی ناک لمبی تھی، پتلی تھی۔ ماتھر اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ کہتا۔

''آشا تیری یہ ناک ریل کی طرح ہر دن کیوں آگے کی طرف بھاگ رہی ہے۔''

''مسٹر ماتھر اپنے کام سے کام رکھو۔''

''کام سے کام تو رکھوں لیکن تیری ناک کا کیا کروں؟''

''اوشٹ اپ۔''

کبھی کبھی وہ گالیاں بھی بک دیتی۔ لیکن مجال تھی کہ ماتھر نے کبھی ہنسی کو ہاتھ سے جانے دیا ہو۔

ریٹا ایک انگلو انڈین لڑکی تھی جو مذاق کا جواب مذاق سے دیتی تھی۔ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی اور اس احساس کی تلخی کو کم کرنے کے لیے ہر ایک پر مسکراہٹ پھینکتی۔ ماتھر اس سے کہتا۔

''او۔ کالی لڑکی ...... تم دلچسپی کا موضوع ہوتی اگر کالی نہ ہوتی۔''

''او۔ مسٹر تمہارے دانت شیر کے جیسے ہیں۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں تم مجھے کھا نہ جاؤ۔''

''آ.....کھا جاؤں۔''

سب ہنس پڑتے۔ ماتھر کی یہی ادائیں دفتر کی زندگی تھی۔ یہ رمیش، موہن اور سلطان جیسوں کی سنجیدگی کا جواب تھی۔ وہ گھر کے بوجھ کو بھول جاتے۔ الجھنوں کو بائی بائی کہہ دیتے۔ گھمبیر لمحوں سے دامن چھڑا لیتے۔

اوشا بھی زیادہ حسین نہ تھی۔ اس لیے وہ بھی ماتھر کی مضمون محبت نہ بن سکی۔ حالانکہ بائیس سال کی عمر میں قدم رکھتے ہوئے ماتھر نے شدت سے محسوس کیا کہ کوئی اس کی مضمون محبت ہو لیکن اب تک کوئی لڑکی نہ اس کو دفتر میں ملی اور نہ باہر۔ اس کی بہن کامنی جوان ہو رہی تھی۔ حسین تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچتا۔

''کاش مجھے بھی کامنی جیسی لڑکی ملتی۔''

پھر خود ہی اپنے خیال کی تردید کرتا۔

''نہیں کامنی جیسی نہیں.....!''

خیالات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ قابو میں نہ آنے والے۔ آتے ہیں جاتے ہیں۔ تیز رفتاری کے ساتھ آدمی کو گرفت میں لیتے ہیں۔ ان سے آزاد ہونا ہر کسی کی کوشش ہوتی ہے۔ وہ کب پیچھا چھوڑتے ہیں۔ کبھی کبھی خیال ہی زندگی ہوتا ہے اور کبھی کبھی انہی کے اردگرد زندگی کٹ جاتی ہے۔

مگر سریتا خیال نہیں تھی۔ حقیقت کا ایک شاہکار تھی، حسن کی ایک بھرپور نمائندہ۔

وہ کامنی تھی یا کامنی کی طرح حسین تھی۔ دفتر میں اس نئی لڑکی سے ہلچل مچ گئی۔ سریتا کو عورتوں میں حسن کی وجہ سے برتری حاصل ہوگئی تھی اس لیے ریٹا، آشا اور اوشا اکثر کھسر پھسر کرتیں۔ شاید وہ کسی ایسے منصوبے کو ترتیب دینے کی کوشش میں تھیں جس سے سریتا کو چلتا کریں اور ان کا مارکیٹ سرد نہ ہو۔ مردوں میں وہ موضوع حسن بن گئی تھی۔ اس کی ہر ادا کو

شاعرانہ خوبیوں سے ناپ تول کے دفتر کا ہر شخص بیان کرتا۔ ماتھران کی تعریفوں کو سن کے قہقہہ لگاتا۔

''مسٹر ... تم چار بچوں کے باپ ہو، تمہیں ان کے جوتوں، کپڑوں، اسکول کی فیس ... کرنی چاہیے ... تمہیں تمہاری بیوی نے چھوڑ دیا ہے تم خود کو اس لائق بناؤ کہ تمہاری بیوی ... آ جائے ... اور موہن کو اپنی استانی بیویوں کے میک اپ کے سامان کی فکر کرنی چاہیے ... اور ... میں ٹھہرا کنوارا...... مجھے سریتا کی فکر کرنی چاہیے۔''

لیکن ماتھر سریتا کی فکر نہیں بلکہ اس سے عشق کرنا چاہتا تھا اور اس عشق کے لیے آسان راہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے سریتا سے کہا۔

''مس سریتا ذرا ان زلفوں کو پردے میں رکھ لیجیے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ ناگن ڈس نہ لیں۔''

سریتا نے تیز آواز میں کہا۔

''مسٹر مجھے آپ کی یہ بے ہودہ حرکت بالکل پسند نہیں۔''

ماتھر نے برابر ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن ہم بھی تمہاری ان لٹوں کو وارننگ دیتے ہیں کہ یہ ہمیں ڈسنے کو کوشش نہ کریں۔''

''مسٹر آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جہاں ایسی بے ہودہ حرکتوں کی اجازت نہیں ہے۔''

اوشا نے کہا۔

''سریتا تم شاید ماتھر کے نیچر سے واقف نہیں ہو۔ یہ Happy go lucky fellow ہے۔'' سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہتی۔ ماتھر اس کا مضمون نہ سمجھ سکا حالانکہ وہ اپنی دل کی دنیا اس سے وابستہ کر چکا تھا۔ لیکن وہاں سنجیدگی تھی جو ماتھر کے لیے موت تھی۔ تین ماہ تک اسے کامیابی نہ مل سکی۔

''شاید کامیابی کا امکان کم ہے۔''

ایک دن سریتا کے چہرے پر وحشت تھی۔ زندگی کے آثار بجھ گئے تھے۔ وہ موت سے زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ماتھر نے کہا۔

"کیا بات ہے کہ تم موت کی طرف دوڑی جارہی ہو۔"

"زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔"

ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آ...... زندگی سے تنگ آگئی۔ تمہارا باپ بیمار ہوگا۔"

"باپ نہیں بھائی وہ بھی چھوٹا۔"

"ہمت نہیں ہارتے۔ جس نے ہمت ہاری، ہنسی ترک کردی وہ مرتا ہے۔ مسئلے مرکر حل نہیں ہوتے۔ کیا تم اپنے بھائی کو مجھے دکھا سکتی ہو۔"

"گھر میں میری بوڑھی ماں ہے اور بیمار بھائی۔ باپ نے سب کچھ میرے کندھے پر چھوڑ دیا۔"

اس دن آفس سے نکل کر ماتھر سریتا کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ گھر بوسیدہ تھا۔ افلاس کی زندگی، سخت اور مشکل زندگی۔ سریتا کا بوجھ سخت تھا مگر گھر میں شرافت، ایمانداری اور سچائی تھی۔

اس ایمانداری اور سچائی کے پیچھے مشکلیں تھیں، مصیبتیں تھیں۔ اس کے چھوٹے بھائی کی ایک ٹانگ اچانک بیکار ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر تسلی دے رہا تھا۔

"میرا ایک دوست میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ میں اس کو ہر بار کرکٹ میں زیادہ سے زیادہ چار رن پر آؤٹ کرتا تھا۔ لیکن حقیقی زندگی میں وہ ڈاکٹر بن گیا اور میں کلرک..... قابل ڈاکٹر ہے۔ کیا تمہارے بھائی کو اسے دکھاؤں۔"

"لیکن!"

"لیکن اس معاملے میں نہیں چلے گا۔ کچھ ہمیں بھی کرنے دو۔" اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹانگ ٹھیک ہونے میں کم از کم ایک سال لگیں گے لیکن روز مالش بھی کرنی ہوگی۔"

ڈاکٹر نے ماتھر سے کہا۔

''میرے دوست تم نے حق دوستی ادا کیا۔ میرے عشق کی دنیا کو آباد کرنے میں تمہاری دوستی کا...''

ڈاکٹر ... کا قہقہہ لگایا۔ ماتھر نے سریتا کو بتایا۔ سریتا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے...

''ڈاکٹر ... ایک سال تک تو یہ امید رہے گی کہ بھائی کی ٹانگ ٹھیک ہوگی۔'' ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''امید نہیں ہے بلکہ صحیح ہے وہ میرا دوست ہے، وہ مجھ سے غلط نہیں کہے گا، جھوٹی تسلی نہیں دے گا۔''

''لیکن آپ میرے لیے یہ تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں۔ میرے دکھوں کے ساتھی کیوں بنتے ہیں۔''

ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سریتا تم سچی بات سننا چاہتی ہو۔''

''ہاں۔''

''سنو..... میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔''

پھر خاموشی چھا گئی، وہی خاموشی جو دلوں کی چاہت کی ضمانت ہوتی ہے۔

ماتھر نے پھر سلسلہ خاموشی توڑا۔

''میں بھی کیسا آدمی ہوں۔ اظہار محبت کر بیٹھا، یہ جان لینے سے پہلے کہ یہ آگ دونوں طرف ہے یا میں ہی اکیلا اس کا شکار ہوں۔''

''محبت کو آگ کہتے ہو..... نہیں..... نہیں..... اس کو نور کہو..... نور...... سچی محبت..... انسان کی سچی عبادت ہوتی ہے۔ زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ میرے دل کے آئینہ خانے میں تمہاری محبت نے اپنا مسکن قائم کیا ہے۔ جس کو وقت کی تند و تیز ہوائیں مٹا نہیں سکیں گی۔ زندہ رہیں نہ رہیں، ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں نہ آئیں، میری محبت میں کوئی فرق

نہیں آئے گا۔"

ماتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے بہت دنوں سے ایک سریتا مجھ سے پوشیدہ رہی جس کی سنجیدگی میں بھی فلسفہ چھپا ہوا ہے۔ جس کی محبت میں محبت کے عظیم معنی و مفہوم پوشیدہ ہیں۔ لیکن میں زندگی کے ہر راگ کو ہنستے ہوئے گاتا ہوں۔ دکھ کی چھاؤں کو بھی خوشی کے پھوار میں بدل دیتا ہوں۔ محبت کو محبت سمجھتا ہوں اور اس کو پھولتے پھلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ ایک دوسرے کے دل میں سما گئے۔ فرصت کے لمحات اکٹھے گذارتے۔ کبھی سمندر کے ساحل پر، جہاں مچلتی ہوئی موجیں شاید اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ آسماں کی وسعت کو چوم لیں اور شاید ماتھر بھی چاہتا تھا کہ وہ سریتا کے لال ہونٹوں کو چوم لے۔ لیکن وہاں صرف ایک ہی جواب ملتا۔

"نا.....نا.....نا"

قدامت کے رنگ میں رنگی سریتا کے خیالات نہ بدل سکے۔ وہ 'نا' پر اٹل رہی۔ ماتھر کی محبت تشنہ رہی۔ آخر کب تک وہ جذبات کو برداشت کرتا۔ سریتا تھی جو ہر بار اس کو ٹالتی رہی۔ ہر بار کسی نہ کسی بہانے اس کی محبت کو تشنہ رکھتی۔ ایک دن وہ ساحل پر گھروندے بنا رہے تھے۔ ریت کے، جو گر جاتے ہیں۔ مخالف ہوا کبھی ریت کے گھروندے کو صحیح سالم نہیں رکھتی۔

"کب تک ریت کے گھروندے بناتے رہیں گے۔ کیوں نہ ہم مضبوط بنیادوں پر ایک گھر تعمیر کر لیں۔"

سریتا نے کچھ سوچ کے جواب دیا۔

"ماتھر صاحب گھر دل میں بنتے ہیں اور گرتے ہیں۔ جب تک دل میں گھر آباد ہو تب تک کسی اور گھر کو بنانے کی ضرورت نہیں۔ دل کے گھر کو آباد رکھنا ہوگا۔"

"وہ تو رہے گا۔" لیکن میرا مطلب ہے کہ کیوں نہ ہم شادی کر لیں۔ جو دوری اب تک ہمارے درمیان ہے۔ وہ مٹ جائے۔"

سریتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سوچنے کی بات ہے۔"

''یعنی مسئلہ غور کے لائق ہے۔'' ماتھر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اب [illegible] مسئلہ کیوں بنانا۔ کوئی دن مقرر کرو ہم دونوں سادے طریقے سے شادی کرلیں۔''

''میرا [illegible] بھائی اور بوڑھی ماں میرے ساتھ ہیں۔''

''دیکھو میں نے پہلے ہی دن کہا کہ تمہارے دکھ میرے دکھ ہیں۔ پھر تم کیوں بھول جاتے ہو کہ دکھ [illegible] ہی گھر میں بدل جائیں گے۔''

''ضرور بدل جائیں گے۔'' سریتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سلسلے میں تمہیں ماں سے بات کرنی پڑے گی۔''

''اچھا.....جی.....لیکن محترمہ یہ کام بہت مشکل ہے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

''ہمت پیدا کرو۔''

''ہمت پیدا ہو سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر ماتھر سریتا کے قریب ہو گیا اپنی بانہیں پھیلا دی اور کہا اگر میں ایک بار تمہارے نازک ہونٹوں کو چوم لوں۔''

''نا'' سریتا نے انکار کیا۔ ''یہ سب شادی کے بعد۔''

''لیکن'' ماتھر کوشش کرنے لگا۔

سریتا نے بڑی مشکل سے خود کو اس کی بانہوں سے چھڑایا اور غصہ میں بولی۔

''اب میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ میں جا رہی ہوں۔''

وہ چلی گئی، ماتھر دیکھتا رہ گیا۔ اسے اپنی بے بسی پر سخت غصہ آیا۔ پھر ہنس کر خود سے کہنے لگا۔

''چلی آئے گی سرکار بندھی کچے دھاگوں سے۔''

لیکن وہ اپنے ان تشنہ جذبات کا کیا کرے۔

''عجیب لڑکی ہے یہ سریتا بھی۔ اب تک قدیم خیالوں کو سینے سے لگائے ہوئے بیٹھی

ہے۔"

ماتھر کو وہ زمانہ یاد آیا جب والدین کی موت کے بعد اس نے شراب سے دل بہلایا تھا۔ آج اسے پھر وہ ہی شراب یاد آئی، وہی نشہ یاد آیا۔

یہ جذبات بھی کبھی کبھی بے ہودہ ہوتے ہیں، ستاتے رہتے ہیں۔ ان [illegible] بات نہیں ملتی، دماغ ان میں الجھ جاتا ہے۔ یہ ماتھر کو پسند نہیں تھا کہ وہ سنجیدہ ہو جائے اور [illegible] موت کا شکار۔ خود بہ خود اس کے قدم شراب خانے کی طرف بڑھے۔ جہاں چند سال [illegible] اس نے دل کھول کے شراب پی تھی۔

وہی پرانی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور گندی میزوں پر خالی بوتلیں۔ کچھ پہلے سے ہی بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ کچھ بے ہوش ہو رہے تھے اور کچھ اناپ اشاپ بک رہے تھے۔ جب ماتھر ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔ اس کو کامنی یاد آ گئی، وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن دوسرے لمحے بوائے نے اس کی میز پر شراب رکھ دی۔ سرخ شراب، اس شراب کی سرخی میں اس کو سریتا کے لال ہونٹ نظر آئے، اس نے جلدی جلدی پیگ کو ہاتھ میں لے کر جام پر جام پینے شروع کیے۔ وہ جذبات کے خوں کا بدلہ شراب سے لے رہا تھا۔

"اس کے سرخ ہونٹ نہ چوم سکا، تھوڑی دیر کے لیے اس کے لب سے شراب نہ پی سکا لیکن وہ کیا سمجھتی ہے؟"

وہ بہک گیا، بھلا ہو شراب کا جو تلخ ہوتی ہے لیکن تلخی میں بھی زندگی کو خواب ناک بنا دیتی ہے۔ مگر حقیقت پھر بھی حقیقت ہے۔ وہ ٹوٹی کرسی سے اٹھا، ارد گرد نظر ڈالی۔

پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"چل بیٹے آج تو بہک گیا ہے۔ لیکن مایوس نہیں ہوا جس دن تو مایوس ہوا اس دن تو سنجیدہ ہو جائے گا۔ اور جس دن سنجیدہ ہوگا اسی دن مر جائے گا۔"

بہکتے ہوئے قدم اور بہکتی ہوئی آواز کے ساتھ وہ اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے شراب خانے سے باہر نکلا۔

"اس دن تو مر جائے گا۔ ہاں مر جائے گا۔"

اماوس کی رات تھی، ہر طرف تاریکی۔

[illegible] پہنچ جاؤں؟"

[illegible] تھیں لیکن آج اس کے لیے اجنبی تھیں۔ وہ بھی اجنبی بن کے ان راہوں [illegible] ریتا کو منائے گا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے دل سے ایک سرد آہ نکلی۔

[illegible] سریتا۔"

لیکن دوسرے لمحے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ دروازہ جس میں وہ پچیس سال داخل ہوتا رہا، باہر آتا رہا، آج نہیں مل رہا تھا۔

آخر کار اس کو اپنا گھر مل گیا۔ دروازہ کھول کر اپنے آنگن میں وہ چیخنے لگا۔ کامنی..... میری بہن کامنی.....کامنی۔"

جس کو وہ چیخ سمجھتا تھا وہ آواز دوسروں کے کان میں نہیں پہنچی۔ گرمی کی شدت تھی، آواز حلق سے نہیں نکلی۔ ماتھر کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے لباس کو تار تار کر دے۔ جسم کے انگ انگ کو سرد کر دے۔ لیکن کیسے۔ اس کا جسم انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔

"کب یہ سرد ہوگا۔"

اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سنسان کمرہ خوف اور ڈر کی طرح۔

پھر دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

وہاں کامنی تھی......نیند کی آغوش میں.....حالات سے بے خبر ایک سوئی ہوئی جوانی تھی۔ زندگی کا پر خمار خواب تھا یا حقیقت۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے چہرے پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

سینے کا کچھ حصہ عریاں تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ماتھر نے چادر سنبھالی۔ اس کے جسم کو ڈھانپنے کے لیے لیکن جب چھاتیوں کے قریب پہنچا.....نیم عریاں چھاتیاں۔ اس کو سریتا یاد آ گئی۔ تیزی سے ایک خیال نے اس کو اپنی گرفت میں لیا۔ وہ چاہتا تھا..... ہاں وہ..... چاہتا تھا۔

''ایک بار صرف ایک بار وہ کامنی کو اپنے بازوؤں میں کس لے۔ اس کی چھاتیوں

بے تحاشا چوم لے۔''

''دوسرے لمحے وہ چیخ پڑا۔

''نہیں۔''

اور زندگی میں پہلی بار وہ سنجیدہ ہوگیا۔

# ہڑتال

منورام یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ممبئ کو پر رونق بنانے میں فلمی دنیا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جب بھی وہ اسٹوڈیو جاتا تو سوچتا کہ اگر کبھی فلمی دنیا نے ہڑتال کی تو ممبئ کا کیا حال ہوگا؟ کہاں تک اس کی رونق پھیکی پڑے گی۔

آخر کیا ہوگا؟

جب بھی وہ میرین ڈرائیو چرچ گیٹ اور باندرہ کی سڑکوں پر گھومتا تو لوگوں کو فلمی ستاروں کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے دیکھتا۔ اکثر تبصروں کا تعلق نئے نئے اسکینڈل سے ہوتا۔ شاید فلمی ستاروں کے انہیں اسکینڈلوں سے فلمی دنیا جواں تھی۔ منورام سوچتا کہ سڑکوں، گلیوں میں جو لوگ جھرمٹ میں ہوکر ان تبصروں سے مشغلوں کا کام لیتے ہیں۔ فلمی دنیا نے ہڑتال کی تو ان لوگوں کے شغل کے سامان کا کیا ہوگا؟

یہ سوال منورام کے ذہن میں اس وقت بھی تھا۔ جب وہ انبالہ سے یہ امید لے کر ممبئ آیا کہ بہت بڑا اداکار بنے گا۔

تھک ہار کر اکسٹرا ضرور بن گیا تھا۔ جس کو ہر دن ۸۰۰ روپے ملتے تھے۔ لیکن اب بھی منورام خواب کی دنیا میں رہتا تھا کہ کبھی نہ کبھی اداکار نہ سہی لیکن ہدایت کار ضرور بنے گا۔

اگر فلمی دنیا نے ہڑتال کی تو اسے ۸۰۰ روپئے کہاں سے ملیں گے۔ وہ ہر ۸۰۰ روپے کے نوٹ کے بعد دوسرے دس کے نوٹ کے انتظار میں رہتا۔ ایک دن اسٹوڈیو بند تھا۔ اس کو ۸۰۰ روپیہ ڈوبتا نظر آیا۔

اسٹوڈیو کے باہر اسٹوڈیو کے ملازم جمع تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے اور کاغذ

کے بورڈ تھے۔

''فلم سینا اپنی مانگوں کو منوا کے رہے گی۔''

''ظلم اب برداشت نہیں کیا جائے گا۔''

فلمی دنیا کی ہڑتال شروع ہوئی۔

منورام پتھریلے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ پروڈیوسروں اور ڈسٹری بیوٹروں کے جھگڑے میں کیا مفلس مزدور پسے جائیں گے۔

مفلس کا کام ہی ہے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر امیروں کے لیے ہڑتال کرے۔ کل تک جہاں راہ گیر داخل ہونے کے لیے ترستے تھے۔ اب اسٹوڈیو کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ ہڑتال کا یہ جلوس بمبئی کی شاندار سڑکوں پر نعرے لگاتے ہوئے اور سینما بند کراتے ہوئے جناح ہال پہنچ گیا۔

لیکن اس شاندار جلوس نے منورام کو ۸۰۰ روپئے نہیں دیے۔ اس کو بھوک نے اتنا ستایا کہ رونے لگا۔ اس وقت اسے مایا کماری یاد آ گئی کہ وہ اپنی لمبی گاڑی سے آئے اور وہ اس کا دروازہ کھولے۔ نہ جانے اس کے دل میں مایا کماری کے لیے کیوں ایک عجیب جذبہ تھا۔ لیکن اس نے کبھی اس پر ایک غلط نگاہ بھی نہ ڈالی۔

آج منورام اس کے پاس جائے گا۔

شاید مایا کماری کو یاد ہو کہ کبھی اس نے اس کی کار کا دروازہ کھولا تھا۔ شاید وہ اس کی مدد کرے۔

اس نے مایا کماری کے جدید فلیٹ کے دروازے کی گھنٹی دبائی۔ نوکرانی نے دروازہ کھولا۔

''مایا کماری سے کہئے کہ منورام ملنے آیا ہے۔ وہی منورام جو اسٹوڈیو میں ان کی کار کا دروازہ کھولتا ہے۔''

نوکرانی چلی گئی اور کچھ دیر کے بعد واپس آئی۔

''آیئے۔''

وہ دوڑتے ہوئے فلیٹ میں داخل ہوا کہ کہیں ہندوستان کی اس مایۂ ناز اداکارہ کا خیال تبدیل نہ ہوجائے۔ مایا کماری ایک بہترین صوفے پر آرام فرما تھی۔

"آؤ آؤ [illegible]۔ ایک مہینے سے نہ ٹیلیفون آتا ہے نہ ہی کوئی آدمی۔ نہ جانے فلمی ہڑتال [illegible] سارے [illegible] لوگ کیوں بھول گئے۔"

منورام [illegible] داستان سنانے والا تھا۔ ایک ایسی داستان جس میں صرف بھوک کے تذکرے تھے [illegible] مایا کماری نے کہا۔

"منورام! پھل کھاؤ۔"

میز پر پھلوں کی طشتری تھی۔ وہ بھوکا پیٹ لے کر ہی آیا تھا۔ اس نے پھل کھانے شروع کیے۔

"منورام لوگ بہت جلد تبدیل ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہیں۔"

"اب دیکھو.....نا.....میں یہ سمجھتی تھی کہ تم بھی مجھے نہیں پہچانو گے۔"

"آپ مذاق کر رہی ہیں۔ کیا میں ہندوستان کی مایۂ ناز اداکارہ کو نہیں پہچانوں گا۔ جس کے در پر بیسوں پروڈیوسر روز چکر لگاتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" لیکن یہ بات ان دنوں کی ہے۔ جب ہڑتال نہیں تھی، جب کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ فلمی دنیا بند ہوجائے گی۔ جیسے اب سب کو لگ رہا ہے کہ فلمی دنیا شاید اب کبھی نہ کھلے۔

مایا کماری نے میز پر تاش رکھتے ہوئے کہا۔

"منورام پتے بانٹو۔"

"جی میں۔"

"ہاں......ہاں۔"

اس نے تاش کی پتیاں سنبھالی۔ مایا کماری نے تاش کے پتے سجاتے ہوئے کہا۔

"کل تک جو پروڈیوسر میرے فلیٹ پر چکر لگاتے ہوئے نہ تھکتے تھے آج کل ان کو

ٹیلیفون پر بھی بات کرنا گوارا نہیں۔ ان کے گھر والے کہتے ہیں کہ صاحب میٹنگ میں ہیں
میٹنگ کے لیے ڈرافٹ بنا رہے ہیں۔ ہم سے نہ ملنے کے حیلے، بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ نیل کو
تم جانتے ہو نا!''

''جی ہاں.....اچھی طرح جانتا ہوں۔''

نیل کو چار سال ہوئے تھے۔ اس نے دو تین فلموں میں کام کیا تھا۔ ... سیکنڈ کلاس
اداکار مانا جاتا ہے۔

''میں پرسوں اس کے گھر گئی۔ اس سے کہا کہ کلب تک چلیں۔ لیکن اس نے یہ بتایا
کہ بیوی کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ جیسے ان لوگوں کو یقین ہو کہ فلمی دنیا اس ہڑتال کے ساتھ
ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔''

اس اثناء میں مایا کماری کی نوکرانی نے شراب کے دو پیگ میز پر رکھے۔

''منورام اپنا پیگ سنبھال لو۔''

''میں''منورام نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''ہاں منورام بھول جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ جس طرح ہم سب کچھ بھولنے کی
کوشش کرتے ہیں۔''

اب منورام حیرانی کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس فلمی ہڑتال
نے سب کچھ تبدیل کیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے فلمی دنیا بند ہو جائے اور وہ اسی طرح
مایا کماری کے ساتھ تاش کھیلتا رہے۔ ایسی ہی فضا میں جہاں مایا کماری مایا کماری نہ ہو۔ جہاں
منورام، منورام نہ ہو۔ مایا کماری کی آواز اس کے خیالات میں دخل انداز ہوئی۔

''وہ ستیش ہے نا جس نے صرف ایک فلم میں کام کیا، جو ہر وقت اس کوشش میں رہتا
تھا کہ میرے ساتھ فوٹو کھنچوائے۔ آج اس کو اچانک یاد آیا کہ اس نے ایم۔ اے۔ انگلش میں
پاس کیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کم پڑھی لکھی ہوں اس لیے کوئی کام نہیں کر سکتی۔ لیکن نہیں فلمی
دنیا بند نہیں رہے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔''

''میرا!''

وہ تو دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ فلمی دنیا ہمیشہ کے لیے بند رہے۔ لیکن اس چھوٹے سے ریڈیو نے جو مایا کماری کے بغل میں تھا، اس کی دعا رد کر دی۔

فلمی دنیا کی ہڑتال ختم ہوئی۔

مایا کماری اب اس کے سامنے نہیں تھی۔ وہ شاید ان پروڈیوسروں کے پاس چلی گئی جن کو چند لمحے پہلے [illegible] اور ستیش کے پاس گئی جن کو اس کے ساتھ چلنا چند گھنٹے پہلے گوارا نہ تھا۔ منورام اس کی [illegible] حالت کو دیکھتا رہا۔ پھر بھی اس کو یقین تھا کہ مایا کماری اس کو کبھی نہیں بھولے گی۔

دوسرے دن وہ اسٹوڈیو میں اس طاق میں بیٹھا تھا کہ مایا کماری کی لمبی کار آئے اور وہ اس کا دروازہ کھولے۔ کار آئی اور اس نے دروازہ بھی کھولا۔ لیکن مایا کماری نے اس پر نگاہ نہ ڈالی۔ وہ مایا کماری منورام کو بھول گئی جس نے اس کے ساتھ تاش کھیلا اور شراب پی۔ لیکن منورام بھی یہ بھول گیا تھا کہ یہ فلمی دنیا ہے۔

# یہ تہذیب یافتہ لوگ

گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہیلن کا خاوند اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی نوکرانی کام کاج کر کے اپنے گھر چلی گئی تھی۔ کالونی کے سارے لوگ سو گئے تھے۔ ہیلن جاگ رہی تھی۔ اس کا خاوند ایک موٹر کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اور آج کل دن رات کام میں ہی مصروف تھا۔ تا کہ وہ اتنے ڈالر کما سکے جو اس کے نئے مکان کے چھ فلیٹوں کے لیے فرنیچر مہیا کر سکیں۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی کرایہ دار ان میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ ہیلن سوچ رہی تھی کہ چار پانچ مہینوں بعد اس کے فلیٹ جدید قسم کے فرنیچر سے لیس ہو جائیں گے۔ پھر ان کی ماہوار آمدنی دو ہزار ڈالر ہوگی۔ نہ جانے اس کے بعد وہ کیا سوچنے والی تھی کہ دروازے کی دستک نے اس کے خیالوں کو منتشر کر دیا۔

''فرینک آ گیا۔''

وہ اپنے تھکے ہوئے خاوند کا استقبال ایک حسین مسکراہٹ سے کرتی تھی۔ لیکن دروازے پر تقریباً اکیس سال کی ایک حسین لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں میں ایک بچہ تھا جسے اس نے کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔

''آپ کو کیا چاہیے؟''

لڑکی گھبرائی ہوئی تھی۔

''میں نے سنا ہے آپ کے نئے مکان میں فلیٹ کرایہ پر مل سکتا ہے۔''

ہیلن اس عورت کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیکن وہاں معصومیت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

"لیکن فلیٹ ابھی جدید فرنیچر سے لیس نہیں ہے اور اس حالت......"

"مجھے ایس[illegible] حالت میں ایک فلیٹ چاہیے۔"

ہیلن کو [illegible] تھے۔

"ٹھیک [illegible] آپ کو تین سو ڈالر کرایہ ماہوار دینے پڑیں گے۔"

"ٹھیک [illegible]"

[illegible] پرس سے کرایہ کے تین سو ڈالر بطور پیشگی دیے۔ ہیلن نے رقم کی رسید بنا[illegible] ہوئے [illegible] کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"ریٹا۔"

ہیلن نے رسید اس کے ہاتھ میں سونپ دی اور کہا۔

"ریٹا..... آؤ..... میں تمہیں فلیٹ دکھا دوں۔"

ریٹا اس کے پیچھے چلنے لگی۔ دوسرے مکان کی طرف جاتے ہوئے ان کو فرینک ملا۔

"فرینک یہ ہماری نئی کرایہ دار ریٹا ہے۔ یہ میرا خاوند فرینک ہے۔"

ریٹا اور فرینک نے ایک دوسرے کی خیریت و عافیت پوچھی۔

"فرینک میں ریٹا کو فلیٹ دکھا دوں۔"

فلیٹ تک پہنچ کر ہیلن نے کہا۔

"اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بہت اچھا۔"

ہیلن جاتے ہوئے بھی اس لڑکی کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ جس کے ایک ہاتھ میں بچہ اور دوسرے میں چھوٹا سوٹ کیس اور پرس لٹک رہا تھا۔ اس نے دوسرے دن ریٹا سے کہا۔

"ریٹا تمہارا چہرہ سوجا ہوا کیوں ہے؟"

"نہیں تو..... ایسی کوئی بات نہیں۔"

لیکن ہیلن کو اس کے جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ یہ لڑکی اس کے لیے معمہ بن گئی تھی۔

''ریٹا اس پیارے بچے کو ذرا میرے ہاتھوں میں تو دو تا کہ میں اس کا منھ چوم

لوں۔''

یہ سن کر ریٹا کانپ اٹھی۔

''میں اپنا بچہ کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتی۔''

یہ کہتے ہی ریٹا اپنے فلیٹ میں واپس چلی گئی۔ اس واقعے کے بعد ہیلن [illegible] کا بچہ مزید معمہ بن گئے۔ اس معمے کی شکار اس کی ہمسایہ عورت لوسی میری بھی ہو گئی۔ لو[illegible] رحم دل عورت تھی۔ اس کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا اور بچوں سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس نے [illegible] سے کہا۔

''یہ جو تمہارے فلیٹ میں کرایہ دار ریٹا رہتی ہے۔ اس نے اپنے بچے کو میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کیا۔ میری بات سن کے ہی وہ کانپ اٹھی جیسے اس کے پاس بچہ نہ ہو بلکہ چوری کا مال ہو۔''

''کہیں سچ مچ وہ چوری کا مال نہ ہو۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔''

ہیلن نے اس کے شک کی تردید کی۔ لیکن اس تردید نے شک کو تبدیل نہیں کیا اور اس بات پر دوسرے ہمسائے بھی غور کرنے لگے۔ ریٹا ساری کالونی کے لیے معمہ بن گئی۔ ہیلن نے اس معمے کو حل کرنے کی ٹھان لی۔ ایک دن وہ صبح صبح ریٹا کے فلیٹ پر گئی۔

''ریٹا میں تمہارے بچے کا منھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ذرا اس کو میرے ہاتھ میں دو۔''

''میں اپنا بچہ کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتی۔''

''کیوں؟.......آخر کیوں؟''

''دیکھو ہیلن تمہارے فلیٹ کا تین سو ڈالر کرایہ میں ادا کر چکی اور اس کے بعد تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ تم چلی جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

ہیلن اس کے اس ناروا سلوک سے دل ملول ہوئی۔ لیکن سوچنے لگی کہ اس نے ضرور کوئی ایسی ٹھوکر کھائی ہے جس کی وجہ سے ساری دنیا سے بد دل ہے۔ ہیلن نے فیصلہ کیا کہ اس راز کو حل کر کے ہی رہے گی۔ وہ دوسری صبح بھی ریٹا کے فلیٹ پر گئی۔

''ریٹا۔''

''ہوں۔''

ہیلن اس آ[illegible] جانب بڑھ گئی۔ ریٹا بیمار تھی اس نے نحیف آواز میں کہا۔

''[illegible] اچھا [illegible] ..... ہاں اس کو مر جانا ہی چاہیے۔''

وہ [illegible] کے پاس گئی۔ اپنی بانہوں میں لیا۔ بچے کا رنگ ہیلن اور ریٹا سے نہیں ملتا [illegible]

''میں ڈاکٹر کو [illegible] ہوں۔''

''نہیں..... نہیں'' ریٹا چیخ پڑی۔ ''یہاں کے لوگ یہ جان لیں گے کہ میرا بچہ ان کے رنگ سے جدا ہے۔ وہ مجھے یہاں سے نکال دیں گے۔ میں اس لیے آج تک اپنے بچے کو چھپاتی رہی۔ میں آسرا لینے جہاں بھی جاتی ہوں، میرے بچے کو دیکھ کر یہ سفید فام مجھے کالونیوں سے نکال دیتے ہیں۔ نیگرو کی بستی میں آسرا لینے جاؤں تو وہ مجھے سفید کتیا کہتے ہیں۔ اور رہنے کی جگہ نہیں دیتے۔ بڑی مشکل کے بعد یہ فلیٹ ملا ہے۔ اب یہ بھی میرے ہاتھ سے جائے گا۔ اب..... میں..... میں کہاں جاؤں۔''

''نہیں، اب تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال پائے گا۔''

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے مریض کا معائنہ کر کے دوائی لکھ دی۔

ریٹا نے ہیلن سے کہا۔

''جب مائیک سے میری شادی ہوئی۔ میں بہت خوش تھی۔ میں اس کے رنگ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ موت نے اسے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کیا اور اس وحشی سماج میں اکیلا چھوڑ دیا۔''

وہ تھک گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہیلن نے ریٹا کا جسم کمبل سے ڈھانپ دیا۔ اور اپنے مکان میں واپس آ گئی۔

فرینک سخت غصے میں تھا۔

''وہ کتیا ابھی بھی ہمارے فلیٹ میں ہے۔''

"فرینک! میں یقین نہیں کرسکتی کہ میرے فرینک کے سینے میں ایک وحشی کا دل

دھڑکتا ہے جہاں بنی نوع انسان کے لیے انصاف، محبت اور ممتا نہیں ہے۔"

"میں پہلے خویش اور پھر درویش کے قول پر عمل کرتا ہوں لیکن سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھ سکتا۔ اس سے پہلے کہ لوگ ہمیں انگشت نما کریں یا ہمیں کوئی نقصان پہنچا دیں۔ اس کتیا کو یہاں سے نکال دینا چاہیے۔"

"وہ کتیا نہیں انسان ہے۔" ہیلن غصے سے آگ بگولا ہوگئی۔ "اگر تم نے اس حالت میں اسے نکالا تو میں بھی زندگی بھر کے لیے تم سے دور ہو جاؤں گی۔"

"اف.... کس عورت سے پالا پڑا ہے۔" فرینک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں اس عورت کے لیے لوگوں سے دشمنی مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے اپنا دن رات ایک کر کے اس عمارت کو کھڑا کیا۔ میں اس طرح اس کا جنازہ نکلتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔"

تم اپنے اس اونچے مکان کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہو۔ تمہارا مکان تمہیں مبارک۔ میں جا رہی ہوں۔"

اسی لمحے ریٹا کی نحیف آواز آئی۔

"بہن تم میاں بیوی میرے لیے کیوں لڑ رہے ہو۔ میں جا رہی ہوں۔"

اس کے بانہوں میں وہ بچہ تھا جو ساری کالونی کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ہیلن چیخ اٹھی۔

"کیا ایک معصوم بے ضرر انسان بھی انسان کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا ریٹا۔ یہ تو اصول کی بات ہے اور جب انسان کا ضمیر یہ گواہی دے کہ یہ سب اس کے اپنے اصول کے خلاف ہے۔ وہاں اس کا رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ......"

اچانک شور اٹھا۔ باہر لوگ چیخ رہے تھے۔

"آگ...... آگ۔"

فرینک بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ چند غنڈوں نے اس کے نئے مکان کو آگ لگا دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی برسوں کی محنت خاک ہو گئی تھی۔ مگر اس جلتے ہوئے مکان سے ایک ایسی کرن نکلی جس نے فرینک کو انسانیت سے آشنا کیا۔ جس مکان کو بچانے کے لیے وہ انسانیت ترک کرنے جا رہا تھا وہی مکان جل گیا۔ ہیلن اور ریٹا اس کے ارمانوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اب جو فرینک ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ارمانوں کا خون ہو چکا تھا۔ اس نے ریٹا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو بہن میں اتنا کمزور نہیں جو کسی کا مقابلہ نہ کر سکوں۔"

فرینک کو محسوس ہوا کہ نفرت کا وہ گھر جل گیا۔ جو اس کے اور ریٹا کے درمیان ایک دیوار بن کے کھڑا تھا۔

# سودا

کل شوکت بہت خوش تھا کیونکہ کل اس نے سب کچھ جذبات کی نظر سے دیکھا تھا۔لیکن آج وہ جذبات ٹھنڈے تھے۔سوچ وچار کے ترازو میں ہر بات کو تول کر وہ اسی فیصلے پر پہنچا کہ کل کا فیصلہ اس نے جذبات میں آکر کیا تھا۔اور آج اس کے سامنے زندگی کی عارضی چمک دمک پھیلی پڑ گئی تھی۔

میجر درانی نے شوکت کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنے شراب سے بھرپور پیگ کو ہونٹوں سے لگایا۔ایک لمبی چسکی لی۔

''کیا خیال ہے تمہارا؟''

''کس بارے میں۔''

''زندگی کے بارے میں۔''

''زندگی''شوکت نے گہری سانس لی۔

''آپ اپنی بتایئے۔''

''شوکت،تم لندن جاؤ۔وہاں کے نائٹ کلبوں میں جاؤ،جو وہاں قدم قدم پر ہیں۔ وہاں کسی انگریز لڑکی کو اپنے گورے جسم سے اسکرٹ گرانے تک دیکھو۔پھر اس کے ننگے جسم کا ہر عضو غور سے تکتے رہو۔وہی زندگی ہے،عریاں،بے ترتیب اور بے ہودہ۔''

''خیال اپنا اپنا۔آپ کو خیال ہے کہ زندگی عریاں بے ترتیب اور بے ہودہ ہے۔یہ بات خارج نہیں کی جاسکتی لیکن زندگی بذات خود کیا ہے۔زندگی وہی ہے،جو آپ ہیں،جو آپ کے خیالات ہیں،جو آپ کے سوچنے کا ڈھنگ ہے۔میرے خیال میں زندگی ایک گلستان

ہے۔ اس گلستان میں جہاں کانٹے ہیں، وہاں گل بھی ہیں، جہاں پھول ہیں، وہاں خار بھی ہیں۔"

آزاد فضائیں [illegible] والے کو کانٹے بھی پھول لگتے ہیں۔ زندگی میں اس آرام و آسائش کا کیا [illegible] خون کرنا پڑے۔"

درانی نے [illegible]۔ شراب کا گھونٹ پی کر اس نے نرم اور دھیمی آواز میں کہا۔

"[illegible] دل کا ذکر لانا اچھا نہیں۔ پھر تم تو جانتے ہو شراب کے ہلکے خمار میں زندگی [illegible] اور [illegible] پڑتے ہیں۔"

"میجر" شوکت نے تیز آواز میں کہا۔ "یہ جنگ کا میدان نہیں ہے۔ جہاں گولیوں کی بوچھار ہو..... خون ہو..... پھر ہار اور جیت اور پھر سودے کی باتیں۔"

"تم زندگی کے ہر مورچے پر ہار گئے۔" میجر درانی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"اب تو تمہاری شکست یقینی ہے۔ لیکن تمہارا حریف تمہاری ہار کو ہار بھی گوارہ نہیں کرتا۔ وہ تو سودا چاہتا ہے..... سودا..... ایک ایسا سودا جس میں تمہارا رنگین مستقبل بند ہے۔"

شوکت نے غور سے درانی کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔

"رقم بھاری ہے، دل نازک ہے۔ بھاری رقم کی چوٹ کیسے سہے گا۔ بے حس ہو جائے گا۔ دم توڑ دے گا۔ مانا کہ میں مفلس ہوں۔ سماج کے ایسے حلقے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، رہنے کو گھر اور کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی کی بڑی مشکل ہے۔ لیکن اس طبقے کے لوگ دلوں کا سودا نہیں کرتے، بھاری رقم کے لالچ میں اپنے دل کو پاش پاش نہیں کرتے۔ نہیں میجر، ایسا سودا منظور نہیں۔ میں چاندی اور سونے کے بوجھ تلے اپنے دل کو دفن نہیں کر سکتا۔"

"جذباتی مت بنو مسٹر شوکت۔" درانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زندگی کے فیصلے جوش میں نہیں کیے جاتے۔ پھر وعدے سے انحراف اچھی بات نہیں۔ کیوں بھولتے ہو کہ کل جب تمہارے شاندار مستقبل کا اعلان ہوگا، تمہیں کروڑ روپے نقد ملیں گے۔ اس وقت تمہاری زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔"

''لیکن زندگی پامال بھی ہوگی۔ چاہت کے سبھی راستے بند ہوں گے۔''

''چاہت کو خرید لو۔ حسن کو خرید لو۔ زندگی کے عیش آرام خرید لو۔ یہ سب تمہیں مل سکتا ہے، جب تمہارے پاس کروڑ روپیہ ہوگا۔''

''اچھا ہے کہ تم میرے کہنے پر عمل کرو۔''

اس نے رات بھر سوچا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ چاندی کے چند ٹکڑوں کے واسطے اپنی زندگی قید نہیں کرے گا۔ کل جو وعدہ تھا وہ زندگی کے شوخ رنگوں کی لالچ تھی۔ وہ سب ایک لمحاتی خوشی تھی اور لمحاتی خوشی کے لیے زندگی بھر کا سکوں کھونا عقلمندی نہیں ہے۔ اس نے درانی سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ میں ایک معمولی سپاہی ہوں۔ جس کے پاس کل ایک کروڑ روپئے ہوں گے لیکن یہ سودا بہت مہنگا ہے۔ مجھے منظور نہیں۔''

''پھر غور کرو۔ شاید تم اپنے فیصلے کو بدل دو گے۔''

''نہیں جناب میں نہیں بدل سکتا۔'' شوکت نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ایک کروڑ روپئے اور لفٹننٹ بننے کے عوض آپ کی اپاہج اور اندھی بہن کو اپنی شریک حیات نہیں بنا سکتا۔''

درانی نے اپنے بیگ کو غور سے دیکھا اور خود سے کہا۔

''ہر بار آدمی آخر میں یہی کہہ کر چلا جاتا ہے کہ یہ سودا اس کو منظور نہیں۔''

ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔

# تلخ یادیں

حسب معمول کارخانہ جانے سے پہلے پرکاش ساحل کی سیر کو نکلا۔ وہاں چھوٹے بچے آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کیوں چھوٹے بچوں کے اس کھیل پر اسے ہنسی آئی۔ اس نے سوچا زندگی خود آنکھ مچولی کا کھیل ہے۔ ہر دم انسان وجودی تلخیوں کے جال میں بند رہتا ہے اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں کھو کر نہ جانے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ان کو بھی بھول جاتا ہے جنہیں یاد رکھنا چاہیے۔ اسے روز صبح بھانومتی بھی ساحل پر ملتی۔ وہ بھانومتی کو دیکھ کر کہتا۔

''بھانومتی اچھی ہو۔''

''ہاں اچھی ہوں، آپ کیسے ہیں؟''

''میں بھی اچھا ہوں۔''

اس چھوٹی سی ملاقات کے بعد دونوں اپنی اپنی راہ لیتے۔ دوسری کوئی بات سوچنے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ وہ چالیس سال کا ہونے کو آیا تھا۔ اور بھانومتی تیس سال کی تھی۔

''بھانومتی اب تک کیوں نہیں آئی؟''

وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ شاید بھانومتی نے یہ راستہ ہی ترک کر دیا۔

''اور کرتی بھی کیا۔ کب تک انتظار کرتی۔''

اس کی نظر ایک نوجوان جوڑے پر پڑی جو مفلس طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو چنے کھلا رہے تھے۔ اس کو وہ دن یاد آگئے جب وہ بھی ایک معمولی آدمی تھا۔ افلاس

سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑا اور شہر آ گیا۔ یہاں ہی اس نے موٹروں کی مرمت کا کام سیکھا۔ انہی دنوں اس کی شادی گاؤں کی ایک لڑکی رتنا سے ہوئی۔ گاؤں کی اس الھڑ دوشیزہ کو پا کر وہ پھولا نہ سمایا۔ رتنا کی سیاہ اور لانبی زلفوں کے سائے میں نہ جانے اس نے کتنے بڑے بڑے کارخانے تعمیر کیے۔ اسی جوش نے اسے اپنی ذاتی موٹر مرمت کی دوکان کھولنے پر مجبور کیا۔ اپنا کاروبار جمانے کے لیے اس نے شہر کی مشہور دوکان کرن سنز کے بہترین میکینک [illegible] اچھی تنخواہ پر نوکری دی۔ اس کی تجارت چمک اٹھی۔

کرن سنز کا بوڑھا مالک موہن چندر یہ دیکھ کر دل ہی دل میں [illegible] و تاب کھا کے رہ گیا۔ وہ ایک دن پرکاش کے پاس آیا اور غصے سے چیخنے لگا۔

''کتے کی اولاد تم نے میرا سب سے اچھا کاریگر چھین لیا۔''

پرکاش کو یہ برداشت نہ ہوا کہ کوئی اس کے باپ کو کتا کہے۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ بوڑھے کو دو چار گھونسے رسید کیے۔ بوڑھا بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔

''یاد رکھ، اس کا بدلہ میرا بیٹا تجھ سے لے گا۔''

پرکاش ہنسنے لگا کہ بوڑھا مار کھانے کے بعد بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ پرکاش جانتا تھا کہ اس کا بیٹا فوج میں رہا تھا۔ اس نے جنگ کے زمانے میں کثیر دولت کمائی لیکن اس کا باپ میکینک کی دوکان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس ضد کی وجہ سے باپ اور بیٹے میں ان بن رہتی اور وہ الگ رہتے۔

ایک دن بوڑھے کا بیٹا سندر اپنی نئی کار لے کر اس کی دوکان پر آیا۔

''کہیے جناب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''بھئی اس کے ٹائر میں کچھ خرابی ہے۔''

پرکاش نے موٹر کے ٹائر کی مرمت کی۔

''جناب ٹائر ٹھیک ہو گیا، پچاس روپئے دیجیے۔''

''پچاس روپئے!'' سندر لال حیران ہو کر بولا۔ ''صرف پچاس روپے لیکن میرے

خیال سے تمہارے سو روپے [illegible] جاتے ہیں۔

”جناب اپنا [illegible] ہے۔ میں اصول کا پابند ہوں۔ زیادہ نہیں لے سکتا۔“

سندر لال [illegible] نے کہا۔

”[illegible] آدمی [illegible]“

”[illegible] لیے [illegible] والد سے پہلے ہی ملاقات ہوئی۔“

”[illegible] دو اس [illegible]۔ میں اپنے والد کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن تم ہو بہادر آدمی۔ اچھا آؤ سامنے والے ہوٹل میں چائے ہو جائے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ گہرے دوست بن گئے۔ ایک دن پرکاش نے سندر لال سے کہا۔

”آج میرا جنم دن ہے۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر گھر آیئے۔ میں انتظار کروں گا۔“

سندر لال گھر آیا، پرکاش نے کہا۔

”میرے دوست! یہ میری بیوی رتنا ہے۔“

”یہ میری بیوی بھانومتی ہے۔“

لوگوں نے ان کی دوستی کے ساتھ ایسے قصے بھی وابستہ کیے جن کو سن کر پرکاش کو ان کی گندی ذہنیت پر رونا آتا تھا۔ ایک دن ایک آدمی نے اس سے کہا۔

”کیوں صاحب آپ کی بھانومتی کہاں ہے؟“

وہ غصے کی شدت سے جل اٹھا اور اسے مارتے مارتے زخمی کر دیا۔

پرکاش کو لوگوں کی پرواہ نہیں تھی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ جس کو وہ دوست سمجھ رہا تھا، اس کا سب سے بڑا دشمن نکلے گا۔ وہ اس کی بیوی کو بھگا کر لے جائے گا۔

گاؤں کی اس الھڑ لڑکی کو اس نے اونچے خواب دکھائے اور دوستی کے پاک رشتے کو ناپاک کر کے اپنی پاک دامن بیوی بھانومتی کو بھی طلاق دے دیا۔

ایک دن ساحل کی سیر کرتے ہوئے اس کو بھانومتی ملی۔

”پرکاش، سندر ہم دونوں کو فریب دے گیا۔ کیوں نہ ہم اس فریب خوردہ زندگی کو ایک دوسرے کے ہو کر نئے سرے سے شروع کریں۔“

لیکن پرکاش اب کچھ بھی سوچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''بھانومتی....... عورت نے مجھے دھوکہ دیا۔ دوست نے دوستی کے پاک رشتے کو ناپاک کیا۔ اب مجھے کسی پر بھروسہ نہ رہا۔''

جب بھی بھانومتی اس کو ساحل پر سیر کرتے ہوئے ملتی، وہ کہتا۔

''بھانومتی اچھی ہو۔''

''ہاں اچھی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔''

''میں بھی اچھا ہوں۔''

اس طرح زندگی کے دس سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں نہ جانے کتنے طوفان آئے۔ اب اس کے پاس مرمت کی چھوٹی دوکان نہیں تھی۔ بلکہ ایک بڑا کارخانہ تھا۔

آج بھانومتی ساحل پر نہ ملی۔ بھانومتی کو دیکھ کر ایک قسم کا سکون حاصل ہوتا تھا۔ اور تھوڑی دیر وہ ان تلخ یادوں کو بھول جاتا تھا۔ بھانومتی کے نہ آنے پر اسے اس کی اہمیت معلوم ہوئی۔ اب اسے سمجھ آیا کہ وہ اس کے لیے کس قدر قیمتی ہے۔ اب وہ پرانی تلخ یادوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اب وہ بھانومتی کو اپنانے کے لیے تیار تھا۔ وہ بھانومتی کے گھر کی جانب چل پڑا۔

لیکن بھانومتی کھو گئی تھی۔ موت نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ پرکاش کو زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ تلخ یادوں سے اگر چھٹکارا پانا بھی چاہے تو نہیں پا سکتا۔

# ممبئی جھک جائے گی

جب میں تاج محل ہوٹل کی اونچی عمارت کو دیکھتا تھا تو نہ جانے میرے دماغ میں یہ سوال کیوں اٹک جاتا تھا کہ جب ممبئی جھک جائے گی تو تاج محل ہوٹل کی شاندار عمارت کہاں ہوگی۔ شاید الٹی ہو کر سمندر میں نظر آئے گی۔ یا گیٹ وے آف انڈیا سے ٹکرا کر راک این رول کا منظر پیش کرے گی۔ تب اس میں ٹھہرنے والے امیر لوگ کہاں ہوں گے۔ شاید فٹ پاتھ پر نظر آئیں گے یا جانوں کو بچاتے ہوئے کسی گلی کوچے میں بھاگتے نظر آئیں گے۔ نہیں صاحب۔ یہ لوگ اتنے کمزور دل والے نہیں ہیں کہ ممبئی میں رہنے والے فلمی ستاروں کی طرح ہر سڑک پر اپنے دامن کو پھیلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ لوگ تو کسی زمین دوز کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر ممبئی کو جھکنے سے روکنے کے لیے منصوبہ مرتب کریں گے۔ ممبئی کی دھرتی میں ان کے ایسے راز بھی پوشیدہ ہیں جن کے افشا ہوتے ہی ان کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا ہوگا۔ لیکن یہ تب ہوگا جب ممبئی جھک جائے گی۔ لیکن میں ابھی یہ کیوں سوچ رہا ہوں۔ اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تاج محل ہوٹل کے پٹھان چوکیدار سے کہا۔

''پٹھان بھائی میں نے اس ہوٹل کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ اسے اندر سے دیکھ لوں۔''

''اے بچے تم ہم کو نوکری سے نکلوانا چاہتا ہے۔ بڑے لوگوں کا ہوٹل ہے۔ یہاں چھوٹے لوگوں کا کچھ کام نہیں۔''

پٹھان میرے ساتھ الجھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب ایک حسین لڑکی کی آواز آئی تو وہ خود الجھن میں پڑ گیا۔ حسین لڑکی کے گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹوں کے درمیان سے نہایت غصیلی

آواز نکلی۔

''چوکی دار۔ تم اس فضول آدمی کے ساتھ کیا باتیں کر رہے ہو۔ دیکھا نہیں کہ ہم آرہے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ چوکی دار کچھ سمجھاتا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح چلی گئی۔ پٹھان نے کہا۔

''تم نے ہمارا سارا معاملہ چوپٹ کیا۔''

''بھائی پٹھان اس لڑکی نے ایسا کیا کہا کہ تم لال پیلے ہو رہے ہو۔''

''تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ لڑکی سچ کہہ رہی تھی کہ تم اچھے آدمی نہیں ہو۔''

اچھے برے..... ایک لمبی داستان ہے۔ کون کیا ہے؟ کون جانتا ہے؟

ممبئی کی ان رنگین سڑکوں پر بدمست جوانیوں کا لڑکھڑانا دلفریب ضرور تھا۔ لیکن ان کی ننگی ننگی کالی کالی ٹانگیں مغربیت کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ میری نظر زندگی سے مایوس اور افلاس میں دھنسے ہوئے ان کے چہروں پر اٹک گئی۔ میرین ڈرائیو کی صاف و شفاف سڑک پر مجھے کھولی میں پڑے ہوئے انسانوں کی زندگی یاد آئی۔ اور میں چاہنے لگا کہ یہاں کی اونچی اونچی عمارتیں سمندر میں تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ کوئی اس طرح پکارے۔

''روک لو میرے اس محل کو۔ میں نے اسے تعمیر کرنے کے لیے ممبئی کی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چکلہ چلایا۔ خفیہ طور پر شراب فروخت کی اور نہ جانے کیا کیا اشیاء اسمگل کیں۔ میری برسوں کی محنت کو برباد ہونے سے بچالو۔''

افسوس تو مجھے اس پر تھا کہ کھولیوں میں رہنے والوں نے شور و غل نہیں مچایا۔ وہ اطمینان میں تھے۔ ان کے پاس ایک ہی مسئلہ تھا...... روٹی کا مسئلہ۔ رہنے کو کھولی تو تھی ہی۔ شاندار عمارتیں گرتی ہیں تو گرنے دو۔ ان کا کیا جاتا ہے۔ نہ جانے میں کیا کیا سوچتا اور نہ جانے میرے خیالات کی وسعت مجھ کو کہاں لے جاتی کہ سریلی آواز نے مجھے منتشر کیا۔

''اندھے ہو کیا؟''

یہ تاج محل ہوٹل والی لڑکی تھی۔ جس کے نرم و نازک ہاتھ پر میرا وزنی پیر پڑ گیا۔ مجھے

خود پر غصہ آیا اور اس کے نرم و نازک ہاتھ کو ہمدردانہ نظروں سے تکنے لگا۔ اس نے پھر کہا۔



''اندھا۔''

''اندھا...... [illegible] چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اندھا دنیا میں [illegible] نہیں ہے۔ کوئی دولت جمع کرنے کے لیے اندھا بنتا ہے، کوئی شہرت حاصل کرنے کے لیے [illegible] ئی بھیک لینے کو مصنوعی اندھا بنا جاتا ہے۔''

''[illegible] بے کار [illegible] نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنے [illegible] ری جوتے سے میرے ہاتھ کو زخمی کیا۔ میں تم جیسے آدمی کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔''

یہ کہہ کر وہ چل دی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ممبئی کے Fishing Home نے جس طرح مچھلی کو شیشے کے پنجروں میں بند کر رکھا ہے۔ اسی طرح سنگینوں کے پنجرے میں مفلسوں کو بند رکھا جاتا ہے۔ جہاں آوازیں دم توڑتی ہیں۔ لیکن جب اس Fishing Home کے آگے سیٹھ کی ایک گاڑی نے جانے سے انکار کیا۔ تب اسے پٹرول پمپ تک لے جانے کے لیے دو ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ میں آگے بڑھا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی پٹرول پمپ پر پہنچ گئی۔ میرا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ لیکن خوش اس لیے کہ دو ہاتھ کسی کے کام آسکے۔ میں نے سیٹھ سے کہا۔

''سیٹھ صاحب آپ گاڑی میں پٹرول کم کیوں ڈالتے ہیں؟''

''بھئی تم ان ڈرائیوروں کی نسل سے واقف نہیں ہو۔ یہ گاڑی کی ٹنکی سے پٹرول نکال کر مالک سے چوری کرتے ہیں۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ دنیا میں کون چور نہیں ہے۔ کوئی بڑا چور ہے کوئی چھوٹا۔ کوئی سرکار سے چوری کرتا ہے کوئی اپنے مالک سے۔ اور کوئی خدا سے۔ لیکن نہ پوچھ سکا۔ سیٹھ نے پٹرول ڈال کر مجھ سے کہا۔

''لو۔''

یہ ایک روپیہ کا نوٹ تھا۔

"جی نہیں۔ میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا کہ آپ مجھے معاوضہ دیں گے۔ میں نے

تو یہ کام انسانی فرض جان کر کیا۔"

سیٹھ نے جیب میں نوٹ رکھا اور مجھے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔

"اس پر میرے دفتر کا پتہ ہے اگر کام چاہتے ہو تو اس پتہ پر ملو۔"

سیٹھ کی گاڑی چل دی۔ اندھے کو کیا چاہیے؟ دو آنکھیں میں دفتر گیا

"کہاں تک پڑھا ہے۔"

"جی بی۔ اے پاس ہوں۔"

"اور اب تک کام نہ ملا۔" سیٹھ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "اس دیس میں اگر ہم سیٹھ لوگ نہ ہوتے نہ جانے تم مفلسوں کا کیا حال ہوتا۔"

مطلب کے لیے آدمی الو بن جاتا ہے۔ اس لیے میں نے الو کی طرح لمبی گردن کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے؟"

"اچھا دیکھو..... فی الحال تمہیں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ ملے گی......"

اس سے پہلے کہ سیٹھ کچھ آگے کہتا۔ میں نے کہا۔

"جی جناب ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔"

"اچھا۔"

اس نے چپراسی کو بلایا۔

"اس کو دینا ناتھ کے پاس لے جاؤ۔ وہ اس کو کام سمجھائے گا۔"

اس لمبی اور اونچی بلڈنگ میں میرا کام تھا۔ ادھر کی رقم ادھر اور ادھر کی رقم ادھر کرنا۔
ایک دن وہ لڑکی بھی نظر آئی جو میری رگ رگ میں سما گئی تھی۔

"آداب جنابہ۔"

وہ غصے سے چیخ پڑی۔

"یو.... ایڈیٹ تمہیں بات کرنے کی تمیز بھی نہیں۔"

میں بغلیں جھانکنے لگا۔ جس نے مجھے کبھی بے کار اور بھوکے پیٹ ہونے کا طعنہ دیا



تھا۔ سوچا کہ اس سے کہہ [illegible]

"[illegible] آج [illegible] کار نہیں۔ اس لیے رومانی انداز اختیار کیا۔"

چپراسی دوڑ [illegible] ئے میرے پاس آیا۔

"[illegible] رہے ہیں۔"

[illegible] میں داخل ہوا۔ لڑکی بھی وہاں تھی۔

مسٹر کلرک [illegible] غصے سے چیخ پڑا۔ "تم نے میری بیٹی کے ساتھ ناروا سلوک کیوں

کیا؟"

"جناب مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کی بیٹی ہیں۔"

"شٹ اپ۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی کی تو تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔"

"جی۔"

میں سیٹھ کے کمرے سے باہر آیا۔

تو یہ لڑکی سیٹھ کی بیٹی ہے۔ میں نے طے کیا کہ اس کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔ لیکن

دل کی یہ کیفیت ممبئی کی رنگین اور حسین قہقہوں میں ڈوب گئی۔ دینا ناتھ نے ایک دن مجھ سے کہا۔

"جانتے ہو، سیٹھ کی بیٹی کی شادی سوموار کے دن ہو رہی ہے۔"

میں احتجاج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن احتجاج کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کوئی حق

ہو۔ یہاں تو صرف یک طرفہ محبت تھی۔ سیٹھ نے مجھے بلایا۔

"آج تم کو میرے ساتھ گھر چلنا ہے۔ سوموار کو نرملا کی شادی ہے۔ مجھے مہمانوں کی

فہرست بنانی ہے۔"

"جی بہت اچھا۔"

اس دن پہلی بار میں شاندار کار میں سوار ہوا۔ سیٹھ کی اونچی بلڈنگ پر نظر دوڑائی۔ دل

یہ سوال پوچھنے کے لیے بے تاب تھا۔

"اے سیٹھ تم اتنی دولت کیوں جمع کر رہے ہو۔ ایک ہی تو ہے تمہاری بیٹی۔"

لیکن پیسے کو کس نے چھوڑا جو سیٹھ چھوڑتا۔ کہتے ہیں جب نرملا کی ماں کی موت ہوئی تو سیٹھ نے اعلان کیا تھا کہ اب وہ سنیاس لے گا۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہی پھر دولت بڑھانے کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ گاڑی سیٹھ کی عمارت کے سامنے رک گئی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ سیٹھ کی عمارت جھک رہی ہے اور پھر ساری ممبئی جھکنے لگی۔ سیٹھ چیخ پڑا۔

''بھونچال......میری بیٹی نرملا.......''

اچانک میں نے کہا۔

''آپ کی بیٹی کس منزل میں ہے؟''

''پانچویں۔''

میں پاگل کی طرح بھونچال سے ہلتے ہوئے مکان میں داخل ہوا۔ پانچویں منزل پر پہنچ گیا۔ نرملا پلنگ پر مایوس اور پریشان تھی۔

''نرملا دیوی نیچے آئیے۔ بھونچال......''

''میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ میں کیسے.......''

میں نے اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا۔ اس نے اپنی باہیں میری گردن میں ڈال دیں۔ نیچے آتے ہوئے محسوس ہوا کہ میں دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی ہوں جس کو میں نے چاہا، وہ حسن کی دولت میری گود میں سمٹ آئی ہے۔ آج مجھے جھکتی ہوئی ممبئی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

اس وقت سیٹھ نے یہ نہ کہا کہ تم نے میری بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کیوں کی۔ لیکن ممبئی جھک نہیں سکی۔ بھونچال کا اثر زائل ہوتے ہی سیٹھ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ نرملا اب میرے بازوؤں میں نہ تھی۔ سیٹھ نے کہا۔

''یو ایڈیٹ، تم نے پھر میری بیٹی کے ساتھ بدتمیزی کی۔ تم کو نوکری سے نکالا جاتا ہے۔''

میں سیٹھ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف آسمان کی طرف دیکھ کر آسمان والے سے کہا۔

''ممبئی کب جھکے گی۔''

# الجھے لمحے

صدیوں سے ننگی بھوکی، پیاسی، زندگی وہی کی وہی رہی۔ الٹے سیدھے خوابوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے وہی جوش و خروش..... وہی دم خم..... رواں دواں جذبے۔ وہی جذبے..... جن کی بدولت آدم ہمیشہ بشر رہا۔ بشریت برقرار رہنی چاہیے۔ ورنہ آدمی فرشتہ بن جاتا۔

اور فرشتے.....!!!

بے حس، عمل کے دائرے میں قید، سوچنے کی قوت سے عاری، حکم کے غلام۔ آدمی جذبات کا پتلا، سوچنے کی قوت رکھنے والا، اچھی بری لاتعداد خواہشات کا مالک۔

انوکھی خواہشات کا مالک۔

جیسے طاہر کی ایک انوکھی خواہش تھی۔

وہ ایک بار صرف ایک بار شمی کو برہنہ دیکھنا اور ہزار ہا بوسے چسپاں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ خود سے کہتا۔

''یہ گناہ ہے۔''

پھر سوال کرتا۔

''ثواب کیا ہے؟''

وہ الجھ جاتا..... خود سے..... اپنے خیالات سے۔ شمی اس کے بچپن کے دوست ارشد کی بیوی تھی۔ طاہر اور ارشد ایک ساتھ پڑھے۔ گلی ڈنڈے کے کھیل میں اکثر ارشد طاہر سے ہار جاتا تھا۔

ارشد ڈاکٹر بن گیا اور طاہر ڈائرکٹر۔ اس کی ایک فلم باکس آفس پر ہٹ ہوگئی۔ اب



طاہر تین فلموں کو ایک ساتھ ڈائرکٹ کر رہا تھا۔

ممبئ رنگین تھی۔ اس رنگین دنیا میں طاہر کی توجہ کا مرکز بہت سی [illegible]یاں [illegible]تھیں۔ لیکن جودھ پور کی حسینہ اس کے دل پر قابو پا گئی۔ اپنے شہر کی لڑکی تھی۔ باپ کی پسن[illegible]ں کا انتخاب تھی۔

حسینہ تھی بھی حسینہ۔

...... بادامی آنکھیں۔ ابھرا ہوا سینہ، کتابی چہرہ اور رنگت سرخی [illegible] ڈو[illegible] ہوئی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے اس برقی کی رو میں آجاتا۔ لیکن ممبئ کی رنگین مزاجی........

کیا ارشد واقف ہے کہ میں اس کی بیوی پر عاشق ہوں۔

وہ چیخ پڑا۔

''میں اس کو کبھی معلوم نہیں ہونے دوں گا۔ وہ میرا دوست ہے۔ میں کبھی اپنے دوست کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔

اب ارشد جودھ پور کا مشہور ڈاکٹر تھا۔

''ہیروں کی رانی'' کی شوٹنگ کے سلسلے میں طاہر جودھ پور گیا۔ فلم کی ہیروئن بیمار ہوگئی۔ ساری یونٹ بیکار۔ روزانہ دس ہزار کا خرچ۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن ہیروئن ٹھیک نہ ہوئی۔ پھر کسی نے ارشد کا نام لیا۔ طاہر ارشد کے پاس گیا۔ دونوں گلے ملے۔ دس سال کی جدائی کی داستان ایک دوسرے سے کہی سنی۔ ارشد نے طاہر کو اپنی بیوی شمی سے ملایا۔

شمی کو دیکھ طاہر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ لیکن دوست !!.......

شمی نے آج کھانے کی میز پر طاہر سے کہا۔

''بھائی صاحب.....''

دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے کہے کہ بھائی صاحب نہ کہیں۔ نام تو صرف نام ہوتے ہیں۔ رشتے نہیں۔

اور رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں.......!!

شمی کی آواز نے اسے پھر چونکایا۔



"چند دن پہلے میں نے فلمی اخباروں میں پڑھا کہ آپ اپنی اگلی فلم کے لیے کسی نئی لڑکی کو بطور ہیروئن لینا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔ میری کہانی سچ مچ ایک نئے چہرے کی تلاش میں ہے۔"

"کاش میں بھی فلم ہیروئن بن سکتی۔"

یہ جملہ شمی نے اس انداز سے کہا کہ سب ہنس پڑے۔ ارشد نے کہا۔

She is very much interested in films.

شمی نے کہا۔

"بھائی صاحب......"

طاہر کو وہ دن یاد آ گئے۔ جب وہ بی.اے. کے پہلے سال میں تھا۔ ساتھ ہی گرلز کالج بھی تھا۔ ہر دن چار بجے کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر لڑکیوں پر فقرے کستا تھا۔

اس نے لمبی سانس لی۔

"بڑے اچھے دن تھے وہ.......!"

گرلس کالج میں شمی بھی تھی جو ایک دو دفعہ اس کے فقروں کی زد میں آ گئی تھی۔ ایک دفعہ اس نے شمی کا ہاتھ بھی پکڑا۔

شاید بات آگے بڑھ جاتی۔ شاید وہ شمی کو اپنے قابو میں کر لیتا۔ لیکن انہیں دنوں جودھ پور چھوٹ گیا۔ ممبئی کی فلمی دنیا میں وہ شمی کو بھول گیا۔ شمی کے ساتھ وہ واقعات بھول گیا۔

طاہر کے ذہن میں آیا۔

"کیا شمی ان واقعات کو بھول گئی ہوگی۔"

رات سیاہ تھی۔ نیند آنکھوں سے غائب۔ حسینہ کب کی سو گئی تھی۔ شاید کوئی اچھا سا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

لیکن طاہر کی آنکھوں میں نمی سی شکل تھی۔ پہلی بار وہ اس کے گھر میں سو رہی تھی۔ شمی اور ارشد آج طاہر کے مہمان تھے۔

''ہیروں کی رانی'' کی شوٹنگ مکمل کرنے کے بعد طاہر جب ارشد کے پاس ممبئی جانے کے لیے رخصت لینے گیا، اسے ممبئی آنے کی دعوت بھی دے آیا۔ آج اپنے جوہو کے مکان میں وہ اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ہی گھر میں کبھی کبھی آدمی مہمانوں کی وجہ سے اجنبی محسوس کرتا ہے۔

''نیند کیوں نہیں آرہی؟''

طاہر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بستر سے نکلا۔ بدن پر ڈریسنگ گون ڈالا۔

خود سے کہا۔

''لائبریری سے کوئی کتاب لاؤں۔''

وہ ڈرائنگ روم کو پار کر کے لائبریری میں داخل ہوا۔

''کیا پڑھنا چاہیے؟''

''فلسفے کی کتاب۔''

''نہیں۔''

''کوئی اچھا ناول......!''

''نہیں۔''

''کوئی اچھی سائنسی کتاب......!''

''نہیں۔''

''کوئی جنسی کتاب......!''

''ہاں......نہیں۔'' لائبریری کی ایک چھوٹی الماری سے وسکی کی بوتل نکال کر تھوڑی سی وسکی پیگ میں انڈیلی، آہستہ آہستہ پینے لگا اور الٹ پلٹ کے کتابوں کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت باہر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ ''کون؟''

''شاید چور گھس گیا ہے۔'' وہ سوچنے لگا۔

چور کو پکڑ لینا [illegible] ہیے۔

اس [illegible] نے لا[illegible] کی بتی بجھا دی۔ اندھیرا چھا گیا۔ چور کو پکڑنے کا منصوبہ تیار ہوگیا۔ وہ با[illegible] سایہ کھڑا تھا۔

[illegible] ور کو اپنے بازوؤں میں کس لیا۔

"[illegible]

چور نے [illegible] واز میں کہا۔

"کس کو پکڑ لیا"

شمی نے دھیمی ہنسی کے ساتھ کہا۔

پھر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

"یاد ہے کبھی تم نے میرا بازو گرلز کالج کے سامنے پکڑا تھا۔"

"اور آج تمہارا سارا جسم میرے بازوؤں میں ہے۔"

"آ" وہ ہنس پڑی۔

"اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا۔"

"میں بھی اندھیرے میں نہیں رہنا چاہتی۔"

"تم یہاں کیسے؟"

"کتاب ڈھونڈنے آئی تھی۔"

دونوں خاموش ہوئے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، اچانک شمی نے کہا۔

"تمہاری نئی فلم کو مجھ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔"

"آ...... ہاں...... تم جیسی۔"

شمی ہنسی پڑی۔

"مجھ جیسی........ کام بنتا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"تمہارے ہاتھ کیوں کانپتے ہیں۔"

"خوف کھاتا ہوں۔"

''تم مرد ہو یا عورت۔''

اسی وقت کسی کی کھانسنے کی آواز آئی۔

طاہر خاموش ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ طاہر [illegible] آواز میں کہا۔

''کوئی جاگ گیا۔''

''میں جاتی ہوں۔''

ارشد کھانستے ہوئے جاگ گیا تھا۔

''کہاں گئی تھی؟''

''باتھ روم۔''

حسینہ نیند میں تھی۔ طاہر کی آنکھوں میں چند لمحات پہلے کے واقعات گھوم رہے تھے۔

منزل کتنی نزدیک تھی۔ کتنی دور ہو گئی۔

لیکن وہ الجھ گیا۔

دوست کی بیوی!!

اس نے ذہن کو جھٹکا دیا۔

''کیا بڑا گناہ کرنے والا تھا۔ نجات ملی۔''

حسینہ سو رہی تھی۔ طاہر نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''میں حسینہ کو دھوکہ دوں.....نہیں.....یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

لیکن وہ فرشتہ نہیں ہے۔

فرشتے بے حس ہوتے ہیں!!

داستانوں کی پریوں نے اس کو اپنے گھیرے میں لیا اور ضمیر اور رشتوں کو بھلا دیا۔

وہ سو گیا.....!!

ساری رات بارش ہوتی رہی۔

دوسرے دن وہ دس بجے تک سوتا رہا۔ اسٹوڈیو نہیں گیا۔ گھر میں پڑا رہا۔
بارش تھم گئی۔

اگلے دن وہ کا[illegible] پر گیا۔ دس دن گزر گئے۔ دھیرے دھیرے الجھے لمحات کی گرفت
ڈھیلی پڑنے لگی۔

ایک [illegible] پر ارشد نے کہا۔

''[illegible] لیے نئی لڑکی ملی۔''

طاہر [illegible] شمی نے کہا۔

''شاید ل گئی [illegible]''

اس کی آواز شوخ اور معنی خیز تھی۔

طاہر صرف یہ کہہ سکا۔

''ابھی تلاش جاری ہے۔''

شمی کا منہ لٹک گیا۔ اس دن طاہر بیمار پڑ گیا۔ ارشد ڈاکٹروں کی کانفرنس میں گیا تھا۔
طاہر اور حسینہ کو ایک اداکارہ کی پارٹی میں جانا تھا۔

طاہر نے حسینہ سے کہا۔

''شمی کو ساتھ لے جاؤ۔''

''اس کے سر میں درد ہے۔''

وہ کہنا چاہتا تھا۔

''اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔''

لیکن کہہ نہ سکا۔ حسینہ چلی گئی۔

کڑی دھوپ تھی جھلسا دینے والی آگ سے سارا بدن جلتا تھا۔ پیاسے ہونٹ
پانی کے لیے ترستے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کسی کا نرم و نازک ہاتھ اس کے ماتھے پر پڑا۔
اس نے آنکھیں کھولیں۔ شمی کا ہاتھ تھا۔

''تم۔''

''بخار میں تپ رہے ہو۔''

اس نے کہا۔

''پانی دو۔''

''پیاسے ہو۔''

وہ خاموش رہا۔

بخار ہے!

کڑی دھوپ ہے!!

شمی ہے!!!

ایک ہی گھونٹ میں پانی کا سارا گلاس حلق سے نیچے اتر گیا۔ شمی نے اس کے پسینے سے تربتر چہرے کو اپنے خوشنما رومال سے پونچھا۔

''تمہاری نئی فلم کو نئی لڑکی ملی۔''

وہ خاموش رہا۔

''تمہارے ذہن میں اس لڑکی کی کوئی تصویر ہے۔ اس کا قد کتنا اونچا ہونا چاہیے...... میرے جیسا قد ہونا چاہیے۔ بازو شاید میرے جیسے لہراتے ہوئے بازو۔ اور.....''

طاہر کے ذہن کا آتش فشان پھٹ گیا۔ اس کے پاؤں خود بخود بستر سے باہر آ گئے۔ وہ اپنے پیاسے ہونٹ اس کے جسم پر چسپاں کرنے ہی والا تھا کہ شمی کہہ پڑی۔

''ہمیں بھی کچھ ملنا چاہیے۔''

''کیا؟''

شمی ہنس پڑی۔

''بھولے کیوں بنتے ہو راجہ۔ تمہاری اگلی فلم کی ہیروئن میں ہوں گی۔''

طاہر چونک پڑا۔

''سودا۔''

شمی نے اپنی ہنسی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی کاغذ پر۔''

طاہر حیرانی سے بول پڑا۔

"تم اس جسم کی قیمت چاہتی ہے"

"ہر [illegible] کی قیمت ہوتی ہے۔"

"لیکن میں [illegible] سے پیار کرتا ہوں۔"

"[illegible] کو محبت کہتے ہو۔"

"تم اپنے [illegible] دام وصولِ کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو طوائف کا کام ہے۔" وہ چیخ پڑی۔

"میں طوائف کا کام کرتی ہوں اپنا مقصد پانے کے لیے۔ تم دوست کی بیوی کو اپنے بازوؤں میں لینے کے لیے اس لیے بیتاب ہو رہے تا کہ تم اپنی جنسی پیاس بجھا دو۔ تمہارے پاس بھی مقصد ہے۔ ہر ایک کے پاس مقصد ہوتا ہے۔"

طاہر ٹوٹ گیا۔ پھٹا ہوا آتش فشاں سرد ہو گیا۔

"ہر کام مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ کچھ کام ضمیر کے لیے ہوتے ہیں۔ تم چلی جاؤ..... چلی جاؤ۔"

شمی نے جاتے ہوئے کہا۔

"اب تمہیں ہی بلانا ہوگا۔"

آسمان پر بادل پھیلنے لگے۔

پھر اناپ شناپ فکریں اس کے ذہن میں پھیلنے لگی۔

دوست.....!ضمیر.....!!.......مقصد.......!!!

سب کچھ ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گیا۔

"ضمیر کے جھانسے میں آ گیا۔ دوستی کے جال میں پھنس گیا۔ اپنا مقصد فوت ہو گیا۔"

سیاہی کا پردہ گر گیا۔ ضمیر پتھر بن گیا۔ جذبات بے قابو ہو گئے وہ دوڑتا ہوا......اوپر گیا۔

شمی نے طنزیہ آواز میں کہا۔

"موقعہ کھو دیا۔"

''میں مرد ہوں۔''

''آ......تم عورت سے بھی بدتر ہو۔''

طاہر نے اپنے سینے کو ٹھوکتے ہوئے کہا۔

''میں مرد ہوں مرد......مرد......مرد۔''

وہ قہقہہ لگاتا رہا......

شمی احتجاج کرتی رہی۔

پھر قہقہے تھم گئے۔ چیخیں بند ہو گئیں۔

وہ سر کو دباتے ہوئے بستر میں پڑا ہوا تھا۔

کالے بادل گرجے۔ جذبات میں بھی گرج پیدا ہو گئی......اب اختیار میں کچھ نہ رہا۔

وہ چیخ پڑا۔

''شمی کہاں گئی؟''

وہ ڈرائنگ روم کی جانب چل پڑا۔

شمی جا رہی تھی۔

''رک جاؤ شمی......''

وہ رک گئی۔

طاہر آگے بڑھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اس کا جسم لیا۔

شمی نے کہا۔

''تم کمزور ہو......''

وہ لیٹ گیا۔ لیکن یہ لفظ کانوں کا تعاقب کر رہا تھا۔

''تم کمزور ہو۔''

لیکن وہ سب تصور کے خاکے تھے۔ جو بنتے رہے مٹتے رہے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے اپنی بوجھل آنکھوں کو کھولا اور محسوس کیا کہ وہ فرشتہ بن گیا ہے۔

''فرشتہ۔''

فرشتے۔ [illegible] ہوتے ہیں۔ عمل کے دائرہ میں قید حکم کے غلام۔

[illegible] ـ

[illegible] جب اس نے آنکھ کھولی تو اپنی بیوی کو جھکا ہوا پایا۔

'' [illegible] کہ آپ زندگی کے دائرے میں داخل ہوئے۔''

'' [illegible] گہری سانس لی۔ ''ارشد اور شمی کہاں گئے؟''

''آپ [illegible] دن بخار میں مبتلا رہے۔ نیم بے ہوشی میں رہے۔''

''وہ نہیں جانا چاہتے تھے لیکن ارشد کی ماں بیمار ہوگئی تھی۔ اس لیے ان کو جانا پڑا۔''

وہ سوچتا رہا۔

''شمی گئی۔''

پھر خود سے کہہ پڑا۔

''میں تو فرشتہ بن گیا ہوں۔''

لیکن سمجھ نہیں پایا کہ وہ فرشتہ ہے یا انسان ہے یا کچھ بھی نہیں ہے۔

# دل والی

ایک نرس کو دیکھ کر میں نہ جانے کیوں رک جاتا اور رک کر اس کو تکتا۔ نفسیاتی طور پر مجھے عورتوں کے جدید لباسوں میں نرس کا لباس سب سے زیادہ پسند ہے۔ میرے دوست امتیاز نے مجھ سے ایک دن کہا۔

''واللہ تمہاری پسند بھی کیا پسند ہے۔ عورت کا لمبا سفید لباس۔ ارے انسان بنو...... اور انسان بن کر رنگ برنگی ساڑیوں کے پرستار بن جاؤ۔''

یہ تو دو سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن بقول امتیاز میں لمبے سفید لباس کے سوا کسی اور چیز کا پرستار نہ بن سکا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں ایک سفید لباس پر ہی مر مٹا۔ پہلی بار میں نے اس کو تلک برج کے نرسنگ ہوم سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت نرسوں کے لباس میں غضب ڈھا رہی تھی۔ ایک مصور کے خوابوں کی شہزادی لگ رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہو کر کسی کا انتظار کرنے لگی۔ میں موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پاس کھڑا ہوا۔ یوں تو حسن ہمیشہ بے نیاز ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ایسے ہی کھڑی رہی جیسے میں اس کے پاس کھڑا ہی نہ تھا۔ میں اپنے آپ سے سوال کر بیٹھا۔

''کیا یہ پتھر کی مورتی صدیوں اسی طرح کھڑی رہے گی؟''

لیکن میں عاشق تھا۔ ایک ایسا عاشق جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی محبوبہ سے کہہ ہی بیٹھا۔

''آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے؟''

میم صاحبہ نے کوئی جواب نہ دیا جیسے میں بک رہا تھا۔ میرا خون عشق گرم ہو گیا۔ گرم

سڑک جا رہی ہے

ہو کر جب ا[illegible] بلنے لگا تو [illegible] نے کہا

"محترم [illegible] نے آپ سے سوال کیا تھا کہ کیا بجا ہے؟ لیکن جواب ندارد۔ کیا بات ہے۔ آپ [illegible] جوا[illegible] ل پائی اس لیے کسی کی بات کا جواب دینا گوارا نہیں کرتیں۔"

[illegible] کو ٹھیس پہنچائی اس لیے چیخ کر کہا "آپ پرانے لوفر لگتے ہیں۔ زبان سنبھال کر [illegible]

"شکر [illegible] آخر کفر ٹوٹ ہی گیا۔"

"مسٹر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

حسینہ نے آگے آکے بے باکی سے مجھ سے سوال کیا۔ میں حیران ہو کے اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔ کم از کم میں اتنا بے باک نہ تھا۔ ابھی تو میں چلمن کا شکار ہی تھا مجھے یاد ہے کہ لوگ چاند پر گئے لیکن میں اب بھی عشق کے پیچ و خم سنوارنے میں سال ہا سال صرف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے بھی بے باک ہو کر کہا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے متاثر کیا۔"

"جی ہاں میرے اس چہرے نے آپ کو متاثر کیا ہوگا؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر ایک کو اپنا چہرہ حوالے کرتی پھروں۔"

"نہیں لیکن مجھ جیسا نوجوان جب کسی حسین لڑکی کو یہ کہے کہ مجھے آپ کے چہرے نے متاثر کیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنانا بھی چاہتا ہے۔"

"تو"

یہ تھی میری اور اس کی پہلی ملاقات......اس کا نام سیتا تھا......اور......میں رام تھا، سیتا اور رام کی جوڑی کبھی Laguna ریسٹورنٹ میں نظر آتی تو کبھی ریگل کے سینما ہال میں۔ میرا دوست امتیاز مجھ سے کہتا۔

"تو صاحب آخر ایک نرس کے سفید لباس پر مٹ ہی گئے۔"

میں مسکرا دیتا۔

"لیکن یار ہم کو ملاؤ.....نا.....اس لڑکی سے جس نے تیرا دل چھین لیا۔"

''ملادوں گا دوست۔''

ملاقاتیں ہوتی رہی لیکن میں نے کبھی امتیاز کو سیتا سے نہ ملایا۔

''دل میں ٹھانی تھی کہ شادی کے بعد ہی ملاؤں گا۔''

میں نے ایک دن سیتا سے کہا۔

''چلو آج کورٹ میں سول میرج کریں گے۔''

''رام......کرلیں گے......میرج......اتنی بھی جلدی کیا ہے۔''

میں نے ہوٹل کے بوائے کو بلایا۔

''ذرا ایک گلاس پانی کا دو۔''

''یس سر''

سیتا ہنس پڑی۔

''میرے جواب سے اتنی پیاس بڑھ گئی۔''

''جی ہاں''

میں غصے سے جل اٹھا۔اسی اثناء میں میرے کندھے پر کسی کا ہاتھ پڑ گیا۔میں مڑا تو دیکھا وہ میرا دوست امتیاز تھا۔

''سلام''

''امتیاز تم''

''جی ہاں بندہ ہی ہے۔''

''سیتا، یہ میرا اکلوتا دوست امتیاز نعماتی۔میجر نعماتی کا بیٹا۔''

''میجر نعماتی کا بیٹا۔''

نہ جانے یہ نام سن کر وہ کیوں چونک پڑی لیکن میں نے اس بات کو اہمیت نہ دی۔ کیونکہ میجر نعماتی ایسی شخصیت تھے جن کے جنگلی کارنامے افسانے بن گئے تھے۔اس لیے اکثر لڑکیاں ان کا نام سن کر چونک پڑتی تھیں۔

امتیاز نے گمبھیر ماحول میں اپنی زندہ دلی سے جان ڈال دی۔

بھائی۔۔۔۔۔۔میرے بھائی کو اتنا نہ ستانا کہ یہ اپنے بھائی امتیاز کا نام بھی بھول جائے۔"

۔۔۔۔ماحول میں ایک بار پھر رنگینی آ گئی۔ امتیاز اپنے بے وزن شعر سنائے جا رہا تھا اور ۔۔۔ داد دے جا رہا تھا۔

امتیاز کے جانے کے بعد پھر ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ سیتا نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"رام۔۔۔۔کل ہے نا۔۔۔۔۔سوموار۔۔۔۔۔۔ہفتے کا پہلا دن۔۔۔۔اچھا دن ہے۔ کیوں نا ہم کل کورٹ میں جا کر شادی کریں۔"

میں نے برجستہ جواب دیا۔

"میں نے تھوڑی دیر پہلے ایسا ہی کہا تھا اور آپ کا جواب سن کر مجھے پانی کا گلاس منگانا پڑا۔"

"او۔۔۔۔۔تم۔۔۔۔۔شیطان۔"

وہ ہنس پڑی۔

ہم دونوں اس بات پر متفق ہوئے کہ کل شادی کے لیے کورٹ میں جائیں گے۔ یوں تو نہ اس کا کوئی رشتہ دار نہ ہی میرا کوئی رشتہ دار۔ ہم دونوں نے پہلے ہی فیصلہ کیا تھا کہ شادی خاموش طریقے سے ہوگی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ شادی کے بعد مقامی ہوٹل میں اپنے چند مخصوص دوستوں کو ٹی. پارٹی دیں گے۔

ہم دونوں اس شام نئی صبح کے لیے نئی امنگیں اور نئے جذبات لیے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اپنے لیے چائے بنائی۔ اسٹوو کو دیکھ کر میں مسکرا پڑا۔۔۔۔۔۔اور اس سے کہنے لگا۔

"فکر مت کرو۔۔۔۔۔اب تو گھر والی آ رہی ہے۔ وہ تمہاری اچھی طرح دیکھ بھال کرے گی۔"

گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں مادی دنیا سے خیالی دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں

میں نے خود کو ایک وسیع ملک کا بادشاہ اور سیتا کو اپنی ملکہ پایا۔ حسن کے ایک [illegible] پر ہزاروں لونڈیاں جھک کر کھڑی ہوئی تھیں۔

اچانک کسی نے اس خیالی دنیا کو تتر بتر کر دیا۔ کوئی دروازے پر [illegible] رہا تھا۔ میں نے اپنی نیند بھری آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے مسل دیا پھر ایک انگڑائی [illegible] کھڑا ہوا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے اپنے دوست امتیاز کو پایا۔

''امتیاز تم اس وقت؟''

''ہاں میں۔''

اس نے گمبھیر آواز میں جواب دیا۔

''میں ایک حقیقت تم کو بتانے آیا ہوں۔ سننا چاہو گے۔''

''کیا بات ہے.....بتاؤ.....''

میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ سکون کے ساتھ کرسی پر بیٹھا اور کہنے لگا۔

''تمہاری شادی سیتا کے ساتھ ہو رہی ہے نا۔''

''ہاں''

''نہیں ہوگی۔''

''امتیاز کیا بات ہے تم پہیلیاں کیوں بجھا رہے ہو؟''

''اس بات کو اب پہیلی ہی رہنے دو۔''

''نہیں بتاؤ......کیا بات ہے؟''

میں اضطراب میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''سیتا پہلے ملٹری اسپتال میں نرس تھی نا۔''

''ہاں۔''

''ان دنوں بھی جن دنوں جنگ ہوئی۔''

''ہاں.....ہاں......آگے بتاؤ۔''

''وہ ملٹری کے اس اسپتال میں کام کرتی تھی جس پر ایک دن بم پھٹ گیا۔ اور وہ جل

گئی تھی۔ اس کا آج کا چہرہ اپنا نہیں۔ وہ پلاسٹک سرجری سے بنایا ہوا چہرہ ہے۔ اس کے پاس جو بال ہیں...... وہ [illegible] بال ہیں...... یہ ہے تمہاری سیتا زس۔"

[illegible] آ [illegible] نا نہیں چاہتا تھا۔ میں دوڑتا ہوا سیتا کے پاس گیا۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ [illegible] میں کیا حقیقت ہے...... یا یہ سب من گھڑت کہانی ہے...... یا...... لوگ ہماری [illegible] کر رشک سے جل اٹھے۔ اب ایسی افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ سیتا نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"اتنی رات گئے کیسے آئے؟"

"یہ پوچھنے آیا ہوں جو تمہارا چہرہ ہے وہ اصلی چہرہ ہے یا نقلی۔ تمہارے پاس اپنا بھی کچھ ہے یا سب کچھ آج کی سائنس کی دی ہوئی چیزیں ہیں۔"

وہ بت بن کر کھڑی رہی۔ میری بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سیتا کی آنکھوں سے آنسوں بہنے لگے۔ اس نے کہا۔

"رام...... میرے پاس دل ہے۔ جو میرا اپنا ہے۔"

# بھنگی

بھنگی کا لفظ جب زبان پر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہونٹوں تک ایک گالی چلی آئی ہے۔ اگر میں نے اردو زبان کی لغات کو مرتب کیا ہوتا تو اس لفظ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ لفظ کبھی برے نہیں ہوتے۔ دراصل یہ انسانی ذہن ہے جو لفظوں کو برا بناتا ہے۔ اور ان کو ایک ایسے ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جہاں لفظوں کی اصلیت پر گندا لحاف چڑھ جاتا ہے۔ جب بھی میں لال چوک کی سڑک سے ٹانگے پر سوار گھر کی طرف جاتا تو کسی نہ کسی بھنگی کو سڑک صاف کرتے ہوئے دیکھتا۔ ایسے لمحات پر اکثر آدمیوں کے منہ لٹک جاتے۔ تب میرا دل چیخنے لگتا اور میں خود سے کہتا۔

"اٹھو اور لفظوں کا گندہ لحاف اتار کر پھینک دو۔"

لیکن میرا یہ جذبہ تھوڑی دیر میں ٹھنڈا پڑ جاتا اور میں ایک بار پھر گھوڑے کی رفتار میں کھو جاتا۔ میں غور سے گھوڑے کی رفتار کو دیکھتا۔ آہستہ آہستہ اس کی اس رفتار میں ایک چہرہ نمودار ہوتا...... جانا پہچانا چہرہ..... ایک بھنگی کا چہرہ۔

وہ شروع سے آخر تک بھنگی تھا۔ صمد..... نہیں..... صمد بھنگی..... صمد بھنگی سے سرینگر کے ہر گلی کوچے واقف تھے۔ ہر سڑک کی اس نے گندگی اٹھائی تھی۔ گندے اور صاف کوچے اور گلیاں صمد کو نہیں بھول سکتے۔ ایسا کون تھا جو صمد کو نہیں جانتا تھا۔ اس کا پتہ ہی ایسا تھا۔ وہ شرافت کا ایک پیکر مجسم تھا..... وہ انسان تھا...... لیکن..... ایک بھنگی تھا۔ اس لیے کبھی کسی نے اس کے انسان ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے۔ صمد کی یہ خواہش تھی کہ اس کے گھر ایک اولاد

سڑک جا رہی ہے

پیدا ہو۔ اس نے خانقاہوں کی کھڑکیوں پر کپڑے باندھے۔ لیکن سب بے سود۔ وہ قدرت سے مایوس تھا۔ اس [illegible] اداس رہتا تھا۔

[illegible] مجھے غیر معمولی طور پر خوش نظر آیا۔

[illegible] کیا بات ہے آج تم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے۔"

[illegible] پر خدا مہربان ہوا۔ میرے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ میں حضور باپ بن گیا ہوں۔"

میں نے اس کے مسرت سے بھرپور چہرے کو دیکھا۔ پھر سنجیدہ آواز میں کہا "صمد کیا اس کو بھی بھنگی بناؤ گے۔"

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

"نہیں! بابو وہ بھنگی نہیں بنے گا۔ وہ آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بنے گا۔ میں اس کو خوب پڑھاؤں گا۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ آج ایک بھنگی کچھ اور بول رہا تھا۔ جس کو سماج صرف اندھیرے غاروں میں دیکھتا تھا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا اور چھ سال یوں چلے گئے۔ جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ میں اپنے بیٹے کو اسی محلے کے ایک اسکول میں داخل کرانے گیا۔ جہاں صمد کا بیٹا پڑھ رہا تھا۔

"صمد کا لڑکا کس جماعت میں پڑھ رہا ہے۔"

"کس صمد کا لڑکا۔"

"صمد بھنگی کا لڑکا۔"

"حضور بھنگی کا لڑکا صرف بھنگی ہی بن سکتا ہے۔ ایک سال پڑھا اور چھوڑ دیا۔"

استاد سے یہ بات سن کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بھنگی کا لڑکا مر گیا۔

پھر بہت دنوں بعد مجھے صمد ملا۔ وہ بوڑھا ہو چلا تھا اس کے ہاتھ میں وہی پرانا جھاڑو تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"صمد تمہارا لڑکا زندہ ہے؟"

"زندہ ضرور ہے لیکن بابو میں اس کو وہ نہیں بنا سکا جو بنانا چاہا۔"

مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ جس کی کشتی کو بادِ مخالف نے الٹ دیا تھا۔ ایک دن میں نے اس کو اور اس کے چھوٹے بیٹے کو سڑک صاف کرتے ہو۔ میں چاہتا تھا کہ صمد کے بوڑھے بازوؤں میں ایک بار پھر وہ قوت بھر دوں جو اس کو سماج سے بغاوت کرنا سکھا دے۔

وقت کس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے کسی کو یہ سب جاننے کے لیے فرصت نہیں ہوتی۔ سب اپنی دھن میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہ اور اس کا بیٹا سڑکوں کو صاف کرتے رہے۔ موٹر بسیں، ٹانگے۔ سبھی سڑکوں پر چلتے رہے اور اس کے ساتھ باپ بیٹے کا جھاڑو بھی سڑکوں پر چلتا رہا۔

پھر......پھر ایک دن......صمد کا بیٹا لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے ایک موٹر کی زد میں آ گیا۔ معصوم بچے کا خون سڑک پر پھیل گیا۔ صمد بت کی طرح کھڑا رہا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا اس لیے خدا نے اس کو واپس بلا لیا۔"

دوسرے دن میں نے صمد کو سڑک پر اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا......کیونکہ......وہ......بھنگی تھا۔

# احساس کا گھاؤ

نواب بہادر جنگ کے خاندان کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا تھا۔ وہ زمانہ نہ رہا جب نوابوں کے عیش و عشرت کے نقارے بج رہے تھے۔ اب تو یہ خاندان صرف نام کے رہ گئے تھے۔ ان چند گنے چنے نوابوں کے پاس نہ اقتدار رہا اور نہ ہی دولت۔ لیکن اب بھی وقت کے ستائے ہوئے ان لوگوں کے پاس ایک چیز تھی...... وہ تھی...... نوابی ناک! ان کے پاس لفظ ناک کے معنی یہ تھا کہ بات بات پر غصہ کر کے اپنی برتری جتانا......

نواب عظمت اللہ تیس سال کا نوجوان تھا۔ سنگدل۔ بات بات پر جھگڑلو۔ حال ہی میں لکھنؤ میں مصرا بائی آئی تھی۔

نواب صاحب مصرا بائی کو دیکھ کر دل دے بیٹھے۔ چاہتے تھے کہ مصرا بائی بھی خاندان کی قدیم حویلی میں قیام پذیر ہو۔ لیکن اب تو اس کے پاس صرف حویلی تھی۔ دو تین یا اس سے زیادہ عورتیں رکھنے کے لیے رقم نہ تھی۔ اس لیے مصرا بائی حویلی میں نہ آسکی۔ ہاں البتہ نواب نے اپنے خاندان کی قدیم روایت کو اپناتے ہوئے اسے اپنی داشتہ بنایا۔

مصرا بائی حویلی میں نہ آئی اس لیے نواب صاحب اس کی باہر کی زندگی سے غافل رہے۔ مہنگائی کے اس زمانے میں صرف چند ہزار روپیوں کو اپنا سہارا بنانا کہاں کی عقل مندی۔ اس لیے مصرا بائی کو ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے پڑے۔

وہ مشہور کاروباری حیدر بخش کی محفل کی زینت بن گئی۔ اچانک ہر تھالی کا چمچہ سلطان میاں اس محفل میں آپہنچا۔ سلطان میاں کا یہ پیشہ تھا کہ وہ ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ اور دوسری جگہ کی خبر تیسری جگہ لے جائے۔

وہ نواب عظمت اللہ کے پاس دوڑتے ہوئے آیا اور کہنے لگا
''نواب صاحب مصرابائی نے کب سے آپ کا در چھوڑ دیا''
''کیا مطلب؟''
سلطان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
''حضور نواب صاحب مصرابائی کل حیدر بخش کی محفل میں ناچ رہی تھی۔''
نواب نے خوفناک آواز میں کہا۔
''نواب سے دغابازی...... مصرابائی۔ یہ تو نے اپنے حق میں اچھا نہ کیا۔''
اس نے اپنی خاندانی بندوق اٹھائی۔ سلطان میاں دوڑتے ہوئے نواب کے قدموں سے لپٹ گیا اور روتے ہوئے کہا۔
''نواب صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟''
لیکن نواب عظمت اللہ کا دل پتھر تھا۔ اس نے سلطان میاں کو لات ماری اور اپنی موٹر گاڑی میں سوار ہوا۔ اب تو یہ ہی ایک کار نواب کے پاس تھی۔ جو وہ خود چلا رہا تھا۔ پرانی وضع کی اس کار پر اسے فخر تھا۔ کیونکہ وہ اس کے دادا کی نشانی تھی۔
کار چلاتے ہوئے اچانک اس نے محسوس کیا کہ کار کی بریک فیل ہوگئی ہے۔ وہ بدحواس ہو گیا اور اس بدحواسی میں اس کی کار آتی ہوئی ٹرک سے ٹکرا گئی۔ نواب خون میں لت پت تھا، اردگرد کے کچھ لوگوں نے اس کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا۔
ڈاکٹر نے مریض کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''زندگی کو حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی زندگی کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے۔'' مریض کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ میں دردوکرب چھپا ہوا تھا۔
''ڈاکٹر میں ایک ادیب ہوں جس کی حساس زندگی میں ہر چھوٹا حادثہ موت کے برابر ہوتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے حادثے ہمارے دل پر ایسا اثر کرتے ہیں کہ لاتعداد زخم چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم لوگ یا تو تپ دق کے مریض ہو جاتے ہیں یا دل کے مریض بن کر ہمیشہ کے لیے زندگی اجیرن بنا لیتے ہیں۔ اب دیکھئے...... نا تیسری بار مجھے دل کا دورہ پڑا۔ موت یقینی

تھی۔ میں خوش تھا کہ اس [illegible]ندگی سے چھٹکارا ملے گا۔'' ڈاکٹر نے مریض سے کہا۔

''م[illegible] ہمدا[illegible] ایک قابل ادیب ہو۔ ملک کو تمہاری نگارشات پر فخر ہے۔ اور ملک کو تم جیسے قابل فن[illegible]ورت ہے۔ اور اس سائنسی دور میں ہم آپ جیسے قابل فنکار کو اس آسانی کے ساتھ[illegible] لئے نہیں ہیں۔''

''ڈا[illegible] آپ[illegible] کہنا چاہتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے اپنے سفید گاؤن کی جیب سے بایاں ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

''چند منٹ پہلے ایک مریض کی موت ہوئی ہے۔ اس کا دل جواب بھی صحیح سلامت ہے، اگر تم چاہو تو اس سے تمہارا دل بدلا جا سکتا ہے۔''

''ڈاکٹر میری زندگی جواب بھی ایک لاش سے بدتر ہے ہوسکتا ہے سائنس کا یہ کرشمہ اس لاش میں پھر سے زندگی بھر دے......''

ڈاکٹر نے مسرت بھری آواز میں کہا۔

''مجھے تمہارا یہ فیصلہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ شاباش میرے بچے......شاباش۔''

بوڑھا ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چھ گھنٹے تک آپریشن ہال کا دروازہ بند رہا۔ دل بدلا جا رہا تھا۔ جو احساسات کا مرکز ہوتا ہے۔ جو انسانی جسم میں سب سے اہم مقام رکھتا ہے۔

ہمدانی کو آپریشن ہال سے باہر لایا گیا۔ بوڑھے ڈاکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو اعلان کر رہی تھی کہ اس نے موت پر فتح پائی ہے۔

بیس دن تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہمدانی اسپتال کے بستر پر پڑا رہا۔ پہلی بار جب اس نے آنکھیں کھولی تو بوڑھے ڈاکٹر کو خود پر جھکا ہوا پایا۔

''میں زندہ ہوں ڈاکٹر؟''

"Yes my boy"

ایک ماہ کے بعد صحت مند ہمدانی اسپتال کی دنیا کو خیرباد کہہ کر اپنے گھر واپس آیا۔ گھر کا نوکر اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہمدانی اپنی لائبریری میں چلا گیا۔ وہ کسی اچھی کتاب کا

مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ چھ ماہ سے اس نے کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن آج اس کو لائبریری
ایک قید خانہ لگ رہی تھی۔ وہ چیخ پڑا۔
اس کی آواز بھی قدرے بھاری ہوگئی تھی۔ اس میں پہلی [illegible] نہیں رہی تھی۔
اچانک اس کا دل کسی کی چاہ میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بے اختیار [illegible] ب پر ایک نام
آ گیا۔
''مصرا...... مصرا...... مصرا بائی تم میرے ساتھ بے وفائی نہیں [illegible] سکتی۔ تم بے وفا نہیں
ہوسکتی......''
ہمدانی کی آواز سن کر نوکر دوڑتا ہوا لائبریری میں آ گیا۔ اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے
بولا۔
''کیا ہوا مالک...... کیا ہوا؟''
ہمدانی کو کچھ یاد آیا۔ اس نے دل کی آواز پر قابو پا لیا۔
''کچھ نہیں...... کھانا لگاؤ۔''
نوکر حیرانی سے مالک کو تکنے لگا۔
''مالک آپ کو کیا ہوا...... آپ کی آواز کو کیا ہوا۔''
''کیا مطلب۔''
ہمدانی سوچ میں پڑ گیا۔
''جاؤ..... تم کھانا لگاؤ۔''
کھانا کھانے کے بعد اس کے دل کو کسی چیز کی پیاس محسوس ہوئی۔ وہ کچھ اور چاہتا
تھا...... وہ پھر چیخ پڑا۔
''دین محمد جا کر بازار سے وسکی لاؤ۔ بہت دنوں سے میں نے وسکی نہیں پی۔ نوکر
حیران و پریشان کھڑا تھا۔
''مالک آپ نے زندگی بھر وسکی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر یہ آج آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''
ہمدانی دل کی پیاس کا غلام بن گیا تھا۔

''دیر ... میں ... نے جو کہا۔ اس پر عمل کرو۔''

نوکر کو ہر حال ... کی تعمیل کرنی تھی۔ وہ وسکی کی بوتل لایا۔ اس رات ہمدانی نے خوب وسکی پی۔

صبح ... کا ذہن ایک بار پھر ہوشیار ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

''آخر مجھے ... کیا ہے؟''

وہ اس معمہ کو ... نہ کر سکا۔ شاید آپریشن کے بعد کمزوری کے سبب یہ کچھ ہو رہا ہے۔

اس کے دوست اس سے ملنے آئے۔ ان کو اس کے نئے اور عجب رویہ پر حیرت ہوئی۔ وہ کہنے لگے۔

''ہمدانی آپریشن کے بعد تم بہت بدل گئے ہو۔''

دوستوں نے دنیا کے حوادثوں کا تذکرہ چھیڑا لیکن سب اس کو پھیکے لگے۔ کل تک یہی تذکرے اس کی کہانیوں کی جان تھے۔ دوستوں کے جانے کے بعد اس نے قلم اٹھایا۔ رحمٰن نے ہمدانی کے سامنے زندگی کا دردناک پہلو رکھا تھا۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ زندگی کے اس دردناک پہلو پر وہ ایک بہترین افسانہ لکھ سکتا ہے لیکن دل پر اس حادثے نے کوئی اثر نہ کیا۔ وہاں کوئی تڑپ پیدا نہ ہوئی۔ دل میں کوئی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی۔ جو اس کے قلم کو جنبش عطا کر سکے۔ قلم ایک جگہ رک گیا۔ پھر جب چلا تو اس کا ذہن دل کی الجھنوں میں الجھ گیا۔ اور آخر کار قلم کا نب ٹوٹ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح کہنے لگا۔

''وہ میرا دل کہاں گیا...... اف کیا ہوا ہے مجھے۔''

دل کی حرکتیں اس کے ذہن کو کوفت دینے لگیں جنہیں وہ برداشت نہ کر پایا۔ وہ دوڑتا ڈاکٹر کے پاس گیا اور اپنی ساری روداد سنا دی۔

''آخر یہ سب کیا ہے؟ ڈاکٹر میں کیوں بدل گیا۔ میرے احساسات کیوں بدل گئے۔''

''ہمدانی'' ڈاکٹر نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ ''تمہارے سینے میں اب جو دل دھڑک رہا ہے۔ وہ نواب عظمت اللہ خان کا دل ہے۔''

"نہیں......."

ڈاکٹر خاموش رہا۔ ہمدانی چیخ پڑا۔

"ڈاکٹر مجھے یہ دل نہیں چاہیے۔ مجھے اپنا دل واپس دو۔"

ڈاکٹر نے اس کے سر پر تسلی کا ہاتھ رکھا۔ ہمدانی مایوس گھر آ گیا۔ زندگی نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ نئے دل نے اس کی ذہنی اذیتیں بڑھا دی تھیں۔

گھر پہنچتے ہی ہمدانی نے حیدر بخش کا دعوت نامہ پایا۔ وہ دعوت میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن اکیلے بیٹھ کر دل کی الجھنوں میں بھی نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ہمدانی حیدر بخش کی رنگین محفل میں تھوڑی دیر کے لیے دل اور ذہن دونوں کو بھول گیا۔

اچانک محفل میں ایک جانی پہچانی صورت پائل کی چھم چھم کے ساتھ آ گئی۔ وہ مصرا بائی تھی۔ جوں ہی اس کے جسم نے تھرکنا شروع کیا، ہمدانی کا دل بے قابو ہوتا گیا۔ ناچ جہاں عروج پر پہنچا، ہمدانی کی دھڑکنیں بھی عروج پر پہنچ گئیں۔ وہ چیخ پڑا۔

"مصرا بائی........تم بے وفا نہیں ہو سکتی........مصرا........تم نواب کو دغا دے کر غیروں کی مجلس میں نہیں ناچ سکتی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ہمدانی پر وحشت چھا گئی اور اس وحشت نے ساری محفل پر وحشت طاری کر دی۔ وہ مصرا بائی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انتقام سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ غصے سے اس کا سارا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جیسے سارا خون چہرے میں جمع ہو گیا ہو۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں عجب طریقے سے ایک دوسرے میں الجھی ہوئی تھیں۔ لیکن مصرا بائی تک پہنچنے سے پہلی ہی اس کو کچھ ہوا۔ ڈاکٹر کے آنے تک وہ مر چکا تھا۔

دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر سرخی کے ساتھ آئی۔

"دل کا تیسرا آپریشن۔ مریض صرف تین ماہ زندہ رہا۔"

# یاد

فلم اسٹوڈیو کے پاس جو چھوٹا اور واحد ریسٹورنٹ تھا، وہ احمد خاں کا تھا۔ احمد خان اس کا سب کچھ تھا۔ بیرے سے لے کر مالک تک کے سب فرائض وہ انجام دیتا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیس ٹوٹی ہوئی کرسیاں چار مزید اور بیس چینی کے پیالے تھے۔

اسسٹنٹ ہدایت کار سے نیچے جو بھی آدمی اسٹوڈیو میں کام کرتا تھا۔ وہ ضرور اس ریسٹورنٹ میں دو چار چائے ہفتے میں نوش کر لیتا تھا۔

احمد خان کی زندگی بھی کیا تھی؟ اس نے بھی کبھی یہ خواب دیکھا تھا کہ فلمی دنیا کا بہت بڑا اداکار بنے گا۔ لیکن یہ خواب ریسٹورنٹ میں بدل گیا۔ جہاں فلمی دنیا کے چمچے ہر لمحے اس کے ریسٹورنٹ میں موجود رہتے تھے۔

وہ اداکار نہ بن سکا لیکن فلمی دنیا کے بڑے بڑے اداکاروں کے اسکینڈل اس کے ریسٹورنٹ میں جنم لیتے تھے۔

وہ فلمی دنیا کے نت نئے اسکینڈل سن کے ہنستا تھا۔ یوں بھی وہ زندہ دل آدمی تھا۔ اکثر اشخاص جو اس شہر میں فلمی دنیا کے خواب دیکھتے ہوئے آتے۔ وہ بالآخر احمد خان کے پاس اپنا ٹھکانہ بناتے۔ پھر جب ان کی قسمت چمک جاتی۔ وہ احمد خان اور احمد خان کے ریسٹورنٹ دونوں کو بھول جاتے۔

ایک دن صبح احمد خان اپنی پرانی ٹوٹی ہوئی کرسیوں کو صاف کر رہا تھا کہ ایک نوجوان نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ''بھائی صاحب فلم اسٹوڈیو کہاں ہے؟''

احمد خان نے اس ہیرو ٹائپ نوجوان کا بغور جائزہ لیا۔

''او....... پاشاو.......وہ صاف ہے۔''

''اچھا شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں۔''

احمد خان پھر کرسیاں صاف کرنے میں محو ہوا۔ وہ نوجوان کی [illegible] میں ایک خواب کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ لیکن اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خواب کی کیا تعبیر [illegible]

دن کا کاروبار شروع ہوا۔ پھر وہی گرما گرم افواہوں کا سلسلہ....... اس ہنگامے میں وہ نوجوان بھی تھا۔ احمد خان نے اس سے کہا۔

''کیا چاہیے بابو۔''

''ایک کپ چائے۔''

''دو کپ نہیں۔''

''نہیں میرے پاس صرف بیس روپے ہیں۔''

''باقی خرچ ہو گئے۔''

''ہاں اسٹوڈیو کا چکر لگاتے ہوئے سب پیسے خرچ ہو گئے جو میں گھر سے ساتھ لایا تھا۔ اب تو یہ نوبت ہے کہ شاید فٹ پاتھ پر سونا پڑے گا۔''

نوجوان نے اپنی ساری حقیقت درد بھری آواز میں کہی۔ احمد خان نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''احمد خان کے ہوتے ہوئے آپ کسی چیز کی فکر مت کرو۔''

''وجے تمہارا احسان زندگی بھر یاد رکھے گا۔''

وجے کو پناہ مل گئی ورنہ شاید چند دنوں کے بعد یہ نوجوان یہاں نہ ہوتا۔ احمد خان نے وجے سے کہا۔

''یہ فلمی دنیا ایسی دنیا ہے۔ جہاں آدمی کی شکل وصورت سے زیادہ اس کے کپڑوں کو دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ۳ رہزار روپئے لو اور نئے کپڑے پہن کر اسٹوڈیو میں جاؤ۔'' وجے نے پیسے لیتے ہوئے کہا۔

''خان میں تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔ قدم قدم پر تم مجھے سہارا دے رہے ہو۔''

"میں اسی ... پیدا ہوا ہوں کہ تم جیسے تو جوانوں کو سہارا دوں۔" وجئے کے کپڑے آ گئے۔ خان ... کے چمچے سے اور کبھی ایکسٹرا سے التجا کرتا کہ وہ اس کو کام دلائیں۔

وجئے نے ایک ... احمد خان سے کہا۔

"... میں میرا کوئی چانس نہیں ہے۔ اب میں وطن واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ وہاں ... اسکول میں ٹیچر تھا اور بارہ ہزار تنخواہ پاتا تھا۔ یہاں آ کے نہ میں گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔"

احمد خان نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"ہمت اور صبر سے جب تک آدمی کام نہ لے گا تب تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وجئے تم ڈٹے رہو۔ تمہیں کامیابی ضرور ملے گی۔ پھر احمد خان کے ہوتے ہوئے تمہیں کس بات کی فکر ہے۔"

احمد خان کے حوصلوں نے پھر ایک بار وجئے کو اسٹوڈیو جانے کے لیے تیار کیا۔ آخر کار اس کی محنت رنگ لائی۔ اور بطور ایکسٹرا ایک فلم میں کام مل گیا۔ جس کے اسے پانچ ہزار ملے۔ وجئے کو ایک بار پھر یہ یقین ہو گیا کہ وہ فلمی دنیا میں اپنا خواب پورا کر سکتا ہے۔ جو اس نے بہت پہلے دیکھا تھا۔ وجئے کو دوسری فلم میں ایک چھوٹا پارٹ اور دس ہزار ملا۔ وہ اب تک احمد خان کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن احمد خان نے اس سے کہا۔

"وجئے تم اچھے ہو۔ محنت سے کام کرو۔ منزل بہت نزدیک ہے۔"

وجئے محنت کرتا گیا اور دن بدن اس کا نام فلمی دنیا میں پہچانا جانے لگا۔ ہدایت کار موتی رام نے اپنی فلم "ایک دن کی بہار" میں وجئے کو ہیرو کا رول دیا اور تین سال کا معاہدہ کیا۔ اب وجئے کی ماہوار تنخواہ ۵۰ ہزار روپے مقرر ہوئی۔

وجئے دوڑتا ہوا آیا اور احمد خان کو اپنی کامیابی کی خوشخبری سنائی۔ احمد خان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"وجئے تمہیں اب احمد خان کے پاس نہیں رہنا چاہیے۔ کسی اور جگہ کمرہ لو۔ اب اگر تم میرے پاس رہو گے تو یہ زندگی تمہاری فلمی زندگی پر اثر انداز ہوگی۔"

وجئے نے کہا۔

''لیکن خان یہ کیسے ہوسکتا ہے تم ہی وہ سیڑھی ہو جس پر چڑھ کر میں اس مقام پر پہنچا۔اوراب تمہیں ہی چھوڑ دوں یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

احمد خان نے وجے کو سمجھا کر راضی کیا کہ اب وہ کسی دوسری جگہ رہے۔لیکن اب بھی وہ اکثر صبح وشام احمد خان کے پاس آیا کرتا تھا۔فلم پوری ہونے لگی تھی۔وجے نے بھی دھیرے دھیرے اب شام کواحمد خان کے پاس آنا چھوڑ دیا۔

فلم مکمل ہوگئی۔اب وجے ہفتے میں ایک بار احمد خان کے پاس آتا تھا۔فلم باکس آفس پر Hit ہوگئی۔فلم کے Hit ہونے کے بعد وجے کو تین اور فلموں میں کام مل گیا۔موتی رام کے ساتھ معاہدہ بھی ختم ہوا۔

وجے اب فلیٹ میں رہتا تھا۔اس کے پاس چھوٹی کار بھی تھی۔تھوڑے ہی عرصے میں اس کی پانچ فلمیں مارکیٹ میں آگئی۔

احمد خان نے وجے کی ایک فلم ''غلام کی ملکہ'' کو دیکھتے ہوئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے تماش بین سے کہا۔

''اس چھوکرے کومیں فلمی دنیامیں لایا۔''

تماش بین نے قہقہہ لگا کے کہا۔

''پاگل کہیں کا۔''

وہ جب سنیماہال سے واپس آیا تو اخبار والے کوچیختے ہوئے دیکھا۔

''موتی رام کی مشہور ایجاد وجے کمار،سندر کلپنامیں آرہاہے۔'' احمد خان کے چہرے پرتبسم پھیل گیا۔وہ بڑبڑایا۔

''موتی رام۔''

دور سے وجے ایک تیز رفتار کار میں آرہا تھا۔احمد خان نے پکارا۔

''وجے......وجے۔''

لیکن وجے کوکہاں اتنی فرصت تھی کہ وہ دیکھتا کوئی اسے پیچھے سے پکار رہا ہے۔دنیا کا یہ اصول ہے کہ نہ ماضی کو یادرکھواور نہ ماضی کے ہمدردوں کو ہی یادرکھو.......

# یادوں کی دلہن

''رام داس میرا یہ جنون اسی گاؤں میں شروع ہوا تھا جس جنون نے ایک زہریلے ناگ کی طرح میری زندگی کو ڈس لیا۔ اس جنون نے میری زندگی کو شراب کا غلام بنا دیا۔''

سپرنٹنڈنٹ اشوک نے رام داس سے کہا۔

رام داس اس کا ماتحت تھا اور اس کی زندگی کے خوفناک موڑ کے بارے میں سن رہا تھا۔ اشوک مختلف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے ڈاک خانوں کا معائنہ کرتے ہوئے کاجو پور پہنچ گیا تھا۔ کاجو پور کے چھوٹے پوسٹ آفس میں رام داس پوسٹ ماسٹر سے لے کر چپراتی تک کے سب فرائض انجام دیتا تھا۔

اشوک نے رام داس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ان ہی سرسبز کھیتوں میں میں نے ایک بار اس کو دیکھا۔ پسند کیا، چاہا، زندگی کے ہر گوشے میں اس کی تصویر بسائی۔ میری زندگی کی وہ مرکز توجہ بن گئی۔''

''لیکن یہ سب جھوٹ تھا۔ ایک خواب تھا۔ جسے میں اپنی خوشیوں کی رانی سمجھ رہا تھا۔ زندگی کی بہار سمجھ رہا تھا۔ وہ کسی اور کی زندگی تھی۔ بہار تھی۔ رانی تھی پھر میرے حصے میں صرف جنوں آیا۔ وحشت آئی۔ اور شراب کا نشہ۔''

رام داس حیران تھا کہ اشوک جیسے سخت آفیسر نے کیسے آج اپنی زندگی کی کتاب کے ایک ورق کو ایک ماتحت کے سامنے کھول دیا۔ اشوک کی سنجیدہ آواز پھر ایک بار رام داس کے کانوں میں پڑی۔

''رام داس مجھے آج شراب نہ ملی۔ نشہ نہ ہوا۔ اس لیے میں نے تمہارے سامنے اپنی

زندگی کے تلخ واقعہ کو بیان کر دیا۔ مجھے شراب چاہیے! میں خود کو نشے میں مدہوش کرنا چاہتا ہوں۔

تا کہ یادوں کی دنیا میں چلا جاؤں اور یادوں کی دلہن کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں۔"

رام داس نے اشوک کو غور سے دیکھا۔ لیکن کچھ نہیں بولا۔ بولنے کی جرأت نہیں تھی۔

"رام داس تمہارے گاؤں میں شراب نہیں ملتی۔ لوگ کیسے جیتے ہیں یہاں؟ خیر جیتے ہوں گے۔ لیکن مجھے شراب چاہیے۔ بے خودی چاہیے۔"

رام داس نے مؤدبانہ آواز میں جواب دیا۔

"لیکن حضور شراب کہاں اس گاؤں میں ملے گی۔ اگر آپ کہیں گے تو چائے کا انتظام کروں گا۔ میں نے سنا ہے کہ چائے بھی فرحت اور تازگی بخش دیتی ہے۔"

"تمہاری یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ شراب کا نعم البدل چائے ہی ہوگی۔ جاؤ ہمارے لیے چائے کا انتظام کرو۔"

رام داس نے اپنی عینک کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"جی بہت اچھا۔"

پوسٹ آفس کے ساتھ ہی اس کا گھر تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اپنی بیوی سے کہا۔

"بڑا صاحب آیا ہے، چائے پینا چاہتا ہے۔"

بیوی نے کہا۔

لیکن گھر میں دودھ نہیں ہے۔ تم دودھ لاؤ۔ میں چائے بنا دیتی ہوں۔"

رام داس دودھ والے کی دوکان پر گیا۔

"بھائی دودھ ہے؟"

"رام داس جی آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دن کے اس وقت دودھ نہیں ہوتا۔ دو گھنٹے بعد دودھ ملے گا۔"

رام داس نے تشویش ناک آواز میں کہا۔

"لیکن کچھ تو کرو۔"

"مجبوری ہے۔"

رام داس ... گھر لوٹا۔ بیوی نے اس کو دیکھ کر کہا۔

"... ہوگا۔ دن کے اس وقت دودھ نہیں ملتا۔ میں نے اپنی پڑوسن سے بھی مانگا تھا۔ لیکن ... کا ... ی ختم ہوگیا۔ اب کیا کریں؟"

"... کرنا ... " رام داس نے کہا "تم اشوک کو نہیں جانتی۔ وہ بہت ظالم آفیسر ہے۔ ناراض ہو جائے گا تو میری نوکری پر اثر پڑے گا۔"

رام داس کی بیوی نے دودھ کا انتظام کیا۔ کسی نہ کسی طریقے سے چائے بن گئی۔ اس نے دفتر جا کر اشوک سے کہا۔

"جناب چائے کا انتظام ہوگیا۔"

"ویری گڈ۔"

"میرے گھر آئیے۔"

"او کے۔"

اس نے اشوک کو اپنی جھونپڑی میں بٹھالیا۔ سامنے چائے کا پیالہ رکھا۔

"اچھا جناب آپ چائے نوش فرمائیے۔ میں پوسٹ آفس جاتا ہوں۔"

رام داس کے جانے کے بعد اشوک چائے پینے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ عجیب سا نشہ اس کے ذہن پر چھا گیا۔ وہ پکار اٹھا۔

"رام داس۔"

رام داس پوسٹ آفس میں تھا۔ لیکن جب اشوک کا ذہن بے حس ہو جاتا، ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی۔ تب اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کی آواز سن کے رام داس تو نہیں البتہ مالتی آ گئی۔

مالتی نے کہا۔ "کیا چاہیے آپ کو؟"

اشوک نے نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم؟''

''میں مالتی ہوں۔''

''مالتی!''

''ہاں رام داس کی بیوی۔''

اشوک اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چیخ پڑا۔

''نہیں جھوٹ ہے۔ تم وہی ہو جو مجھے سرسبز کھیتوں میں ملی تھی۔ تم وہی ہو۔ جس کو میں نے چاہا۔ تم میری یادوں کی دلہن ہو....... آجاؤ...... یادوں کی دلہن۔ میرے بازوؤں میں آجاؤ...... نا...... ان بازوؤں......''

مالتی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ تم نشے میں ہو۔ تم بہک رہے ہو...... اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔''

اشوک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یادوں کی دلہن تم نے مجھے بہت پہلے مدہوش کیا۔ اب میں اس مدہوشی میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہاری جستجو کی۔ میں تجھے پانا چاہتا ہوں۔''

مالتی چیختی رہی۔

''ہٹ..... ذلیل....... کمینے....... پاجی.......''

لیکن مالتی کے ان بے ربط الفاظ کو بند کرنے کے لیے اشوک نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ آواز ڈوب گئی۔ یادوں کی دلہن لٹ گئی۔ رام داس گھر آیا۔ مالتی رو رہی تھی۔ اشوک اپنے چائے کے پیالے سے بقیہ چائے پی رہا تھا۔ رام داس نے خلش بھری آواز میں اشوک سے کہا۔

''کیا پی رہے ہو بابو۔''

''رام داس تم۔'' اشوک نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

''چا..... چائے....... پی رہا ہوں۔''

''کیوں چائے پی رہے ہو بابو؟........ کیوں؟........ تمہیں یہ چائے پینے کا کوئی حق نہیں۔ اس چائے میں اس عورت کی چھاتیوں سے نکلا ہوا دودھ ہے۔ جس کی عزت تم نے لوٹ لی۔''

اش[illegible]

''[illegible] جھو[illegible]ل رہے ہو۔''

را[illegible]اس [illegible]پڑا اور غصے میں کہا۔

''کمبخت تم نے اپنی ماں کو لوٹ لیا۔''

اشوک پاگلوں کی طرح کہنے لگا۔

''میں...... نہیں...... میں نے ماں کو نہیں لوٹا۔ میں نے یادوں کی دلہن کو لوٹ لیا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے یادوں کی دلہن کو لوٹ لیا۔''

لیکن حقیقت یہ تھی کہ یادوں کی دلہن لوٹنے والے نے خود اپنے آپ کو لوٹ لیا تھا۔

# گناہوں کا پجاری

"تمہیں اپنے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بدلنا ہوگا۔ ضمیر کو کچل کے رکھنا ہوگا۔ زندگی کو گناہوں کا غلام بنانا ہوگا۔ ایمان کے ٹکڑے کرنے ہوں گے۔ سچائی کو دیکھ کر منھ موڑنا ہوگا۔ تمہیں اپنی زندگی بدلنی ہوگی۔"

"نہ جانے میرے قدم مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔"

اس کی اپنی زندگی بھی اپنے ہاتھوں میں نہ تھی۔ آدمی کا ضمیر جب مر جاتا ہے، سوچ سمجھ سو جاتی ہے تب وہ حیوان بن جاتا ہے۔ لیکن چند دنوں پہلے وہ حیوان نہیں تھا۔ اس کا ضمیر بیدار تھا۔ اس کی سوچ سمجھ زندہ تھی۔ وہ انفرادی طور پر زندگی کے ہر پیچ وخم کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ اسی ضمیر نے اس کو سیٹھ دھنی رام سے یہ کہنے پر مجبور کیا۔

"سیٹھ میں ایسا کام نہیں کر سکتا۔"

"تم ایسا کام نہیں کرو گے تو بھوکے مر جاؤ گے۔ تمہارے چھوٹے بھائی ایڑیاں رگڑ رگڑ کے دم توڑ دیں گے۔ تمہاری ماں یہ منظر دیکھ کر تمہاری جوانی کا ماتم کرے گی۔"

"تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، سر چھپانے کے لیے جگہ اور پیٹ بھرنے کے لیے خوراک۔ اس کے لیے اپنے سر کو نہیں جھکانا پڑے گا۔ غیرت کو قتل نہیں کرنا پڑے گا۔"

سیٹھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرے پیارے، ابھی تمہیں زندگی اور سماج کا تجربہ نہیں ہے۔ ایک دن تمہیں واپس آنا پڑے گا۔ پھر میں جو کام کہوں گا، کرنا پڑے گا۔"

آج وہ سیٹھ دھنی رام کے پاس جا رہا تھا۔

اس کی ماں نے اس سے کہا۔

"ہاں بیٹے تمہاری منطق سن رہی ہوں۔ تمہاری اونچی باتیں سن لی۔ لیکن ہمارا پیٹ نہ بھرا۔ جب تمہارا باپ زندہ تھا کیا ٹھاٹھ باٹ تھے۔ ایک یہ زمانہ کہ دو وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے نہیں ملتی۔ کہنے کو تو جوان بیٹا ہے۔"

یہ سن کے اس کے احساسات بری طرح مجروح ہوئے۔ جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ بے سہارا تھا اس لیے کہ اس کے جذبات اور احساسات کی کوئی قدر نہیں کرتا تھا۔ سب سیٹھ دھنی رام کی طرح پیسوں کے متوالے تھے۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ وہی کیوں، ان متوالوں سے الگ راستے پر ہے۔ اس کو بھی ان کی بے اصول زندگی سے کوئی ربط نہ تھا۔ آج یہی بے ربط قدم سیٹھ دھنی رام کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی مصیبتوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ ایک اندھے نے اس کا راستہ روک لیا۔

"بابو مجھے پار کرا دو۔ میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔"

اس نے خاموشی سے اندھے کا ہاتھ پکڑ لیا اور سڑک پار کرا دی۔ اندھے نے کہا۔

"شکریہ بابو...... تم میرے رہبر ثابت ہوئے۔"

اندھے کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ الگ کر رشید نے کہا۔

"میں تو خود ایک بھٹکا ہوا آدمی ہوں جس کے قدم نہ جانے کس راستے پر پڑ رہے ہیں اور نہ جانے میرے یہ قدم مجھے کہاں لے جائیں گے۔"

"تم تو آنکھ والے ہو پھر کیوں بھٹک رہے ہو۔ راستہ تلاش کرو۔ ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ سن رہے ہو تم.....!"

لیکن رشید تو کب کا چلا گیا تھا اور اپنے الٹے سیدھے قدموں کے سہارے دھنی رام کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دھنی رام نے اسے دیکھ کر کہا۔

"آ گئے تم!"

"ہاں آ گیا ہوں...... اپنے ایمان کے پیرہن کو چاک کر کے آ گیا۔ ضمیر کی زبان

کاٹ کے رکھ دی۔ اصولوں کو بے حس کر دیا۔ جذبات اور احساسات کو [illegible] کر دیا اور اب میں بے ایمانی کے راستے پر چلنے کے لیے آمادہ ہوں۔"

"میں جانتا تھا اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ آؤ میرے ساتھ تمہیں اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملاتا ہوں۔"

سیٹھ دھنی رام اسے ایک بڑے کمرے میں لایا۔ یہاں پانچ آدمی پہلے سے موجود تھے۔ دھنی رام نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آج تمہارے اس گروپ میں ایک نیا آدمی شامل ہو رہا ہے۔ اس کا نام رشید ہے۔ تمہاری طرح یہ بھی بھوک افلاس اور غربت کا مارا ہوا ہے۔ میں نے اس کو پناہ دی۔ اب یہ بھی عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتا ہے۔"

سیٹھ دھنی رام نے رشید سے کہا۔

"یہ برجو ہے۔ جیب کاٹنے میں سب سے بڑا استاد۔ یہ رستم خان ہے۔ سنیما ٹکٹیں بلیک کرنے میں یہ سارے شہر میں مشہور ہے۔ یہ رامو ہے۔ چرس اسمگل کرنے میں سب سے قابل آدمی مانا گیا ہے......اور یہ........"

اس طرح سب کے ساتھ رشید کا تعارف ہوا۔ وہ گناہوں کے اس مسکن میں ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"آج تمہاری تربیت کا پہلا دن ہے۔ رستم خان جس بھکاری کے پاس پانچ ہزار نقد جمع ہیں اس کو رشید لوٹ لے گا۔ تم اس کے ساتھ رہو گے۔" دھنی رام نے رشید سے کہا۔

"رشید! اگر تم کامیاب لوٹے تو تمہیں ایک ہزار روپیہ ملے گا اور اگر تم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو تمہیں قید سے آزاد کرانا ہمارا فرض ہوگا۔ لیکن اگر تم نے میرے ساتھ دغابازی کی تو تمہیں کڑی سے کڑی سزا مل سکتی ہے۔"

شام کا سناٹا پھیل گیا تھا۔ گناہ کا آنچل سیاہ بھوت کی طرح رشید کے ارد گرد لپٹ گیا۔ نہ جانے اس کے ہاتھ پیر کیوں کانپ رہے تھے۔ رستم خان اس کے مزاج میں ٹھہراؤ لایا۔

"چلو۔"

وہ دو[illegible] سڑ[illegible] پر چل رہے تھے۔ رشید نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کے کالروں کو اونچا کیا تاکہ اس کا چ[illegible] چھ[illegible]ائے۔ یہ سب کر کے وہ ایک بھیانک سائے میں تبدیل ہو گیا جیسے کالی رات کے [illegible]ں کا پجاری جا رہا تھا۔ وہ چیخ پڑا۔

"نہیں[illegible]

رستم [illegible]ن[illegible]۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں"

"تم بہک جاتے ہو۔"

اس نے رستم خان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لیکن رات کی سیاہی میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ پڑھ سکا۔

"وہ دیکھو.......وہ.......! وہ قبرستان ہے۔ وہاں وہ بھکاری سویا ہوگا۔ تم اس کی شیروانی اتار لینا۔ وہ اس میں اپنے پیسے رکھتا ہے۔ ہاں ایک اور بات۔" رستم خان نے اپنی جیب سے رامپوری چاقو نکالتے ہوئے کہا۔

"اگر اس نے کسی قسم کی ہاتھا پائی کی تو اس رامپوری چاقو سے اسے سلا دینا۔"

چاقو کو دیکھ کر رشید نے کہا۔

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"جیسا میں نے کہا ویسا کرو۔"

رشید نے خاموشی سے چاقو اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اندھیرے میں اس کے قدم قبرستان کی طرف بڑھ گئے۔ ایک قبر کے پاس بھکاری سو رہا تھا۔ رشید ٹھٹھک گیا۔ مرے ہوئے ضمیر کی دبی ہوئی چنگاری نے ایک بار اسے جھنجھوڑا۔

"تم ایک بے بس اور مظلوم پر ظلم کر رہے ہو۔ تم سچ مچ گناہوں کے پجاری بن گئے۔ تمہارے اندر کا انسان مر گیا ہے۔"

"نہیں......نہیں.......میں مجبور ہوں۔ بے بس ہوں۔ میرے اختیار میں کچھ بھی

نہیں۔"

وہ اپنے آپ سے کہہ اٹھا۔

"میں زندگی کا ہارا ہوا کھلاڑی ہوں۔"

"نہیں......تم ہارے ہوئے کھلاڑی نہیں ہو۔تم زندگی کی د[illegible] [illegible]ں سے بوکھلا گئے۔تم وقت سے پہلے گھبرا گئے۔ہمت کا آنچل ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔"

"نہیں" وہ چیخ پڑا۔

بھکاری اس چیخ سے جاگ پڑا۔

"کون؟"

رشید نے خود پر قابو پایا۔اس کا ہاتھ اس کی شیروانی کی طرف بڑھ گیا۔

بھکاری کہہ پڑا۔

"یہ کہاں سے گناہوں کا پجاری آ گیا۔"

اندھے نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو میرے رہبر کا ہاتھ ہے۔ بھلا رہبر کا ہاتھ کیسے گناہوں کے پجاری کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔شاید مجھے وہم ہوگیا ہے۔"

رشید نے تیزی سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔وہ تھوڑی دیر کے لیے گم سم کھڑا رہ گیا۔اندھے نے رشید کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ رہبر کے لبادے میں گناہوں کا پجاری نہیں بن سکتا۔

وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

# نیلام

میں وقت کے چرخے میں خون جگر کی داستان لکھتا رہا۔کبھی اس داستان میں فاروق بھی شامل تھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہی نہ تھا۔ نئے نئے کردار نئے انداز سے پیش کرنے کا جذبہ نہ تھا۔ فاروق کی شاعری نے مجھے کہانیاں لکھنے پر اکسایا۔ پھر زندگی کے اچھے برے کردار آتے رہے۔

بی.اے پاس کرنے کے بعد ہی فاروق کو ایک روزنامہ نکالنے کی سوجھی۔ہم دونوں نے مل کر ''سنگ ساز'' کو پروان چڑھایا۔ چند ہی دنوں میں اپنی بے باکی کی وجہ سے ''سنگ ساز'' عروج کی منزل کی طرف رفتار سے دوڑنے لگا۔کوشش یہی تھی کہ کسی کا دل نہ ٹوٹے۔لیکن پردے جب گر جاتے ہیں تو کچھ اچھے چہرے بھیانک بن جاتے ہیں۔اجمل خان بندوق والے کے ہاں دولت کی نہر بہتی تھی۔لیکن اگر اس نہر میں کالا بازار کی دولت بہتی ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ بندوق والے کو یہ بات پسند نہ آئی کہ کوئی اس راز کو جو کبھی راز نہ تھا، سے پردہ اٹھائے۔انہوں نے مجھ سے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''جناب اپنے اخبار میں اپنی تحریر کی تردید کیجیے۔یہی آپ کے حق میں اچھا ہوگا۔''

میرا دوست بولا۔

''اگر کر دیں تو۔''۔

سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''معقول معاوضہ دیا جائے گا۔''

میں نے کہا۔

"اگر نہیں کریں تو۔"

سیٹھ نے غصہ میں کہا۔

"تو آپ کا اخبار بند ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ کی زبان بھی بند ہوگی۔"

میں جوشیلا آدمی، کب سیٹھ کے جھانسے میں آنے والا تھا۔ لیکن میرا دوست تجارت کے ترازو پر نظر رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے صاف اور واضح الفاظ میں مجھ سے کہا۔

"میاں مجھے یہ اخبار چلانا ہے اس کو زندہ رکھنے کے لیے ٹھن ٹھن کرتے ہوئے پیسے چاہئیں۔ اس لیے مجھے سیٹھ کے ساتھ صلح کے لیے ہاتھ بڑھانا ہوگا۔"

میں نے کچھ نہ کہا۔ ہاں اخبار "سنگ ساز" کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ گھر واپس آیا۔ ایمان کو سینے سے لگایا۔ دوسرے دن ایک دفتر میں ۱۰/ ہزار روپئے کی کلرک کی نوکری شروع کردی۔

یہ تو سچ ہے کہ اخبار کے ہاتھ سے جانے کا افسوس بہت دنوں تک رہا۔ لیکن اب فرصت کے لمحات اپنی کہانیوں میں صرف ہونے لگے۔ ایک دن مقامی کالج میں "بزم افسانہ" میں شمولیت کرنے کی دعوت ملی۔ تعارف کرانے والے نے میرا تعارف اس انداز سے کرایا کہ سب محسوس کرنے لگے کہ اس شہر کا ادب میرے بغیر نامکمل ہے۔ "سفر انجان ویران دن" کی کہانی نے تمام محفل پر سکوت طاری کردیا۔ کہانی تو ختم ہوگئی لیکن خاموشی بہت دیر کے بعد ٹوٹی۔ کہانی نے تمام سامعین کو متاثر کیا۔

میمونہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئی تھی۔ محفل ختم ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئی۔ کہانی کی اختتام کے بارے میں وہ کچھ وضاحت چاہتی تھی۔ لیکن دراصل اپنی اظہار محبت میں ابتدا چاہتی تھی۔ وہ گندمی رنگ کی دلکش لڑکی تھی۔ میرے دل میں بھی اس کے لیے محبت جاگ پڑی۔ میں بھی اس کو چاہنے لگا۔ پھر اکثر ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

ایک دن میں نے میمونہ سے کہا۔

"ہماری شادی ہوگی!"

"ہوگی۔"

"لیکن میں دس ہزار کی کلرکی کرتا ہوں۔"

وہ مسکرا...

"لیکن ہمارے پاس بہت دولت ہے۔"

"میرے پاس دولت...... میں نہیں سمجھا۔"

"تمہاری کہانیاں تمہاری دولت ہیں۔"

میں اس کو پیار بھری نظروں سے تکنے لگا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھوں سے خمار ٹپکتا ہے۔"

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"زکام ٹپکتا ہے۔"

"زکام!"

"ہاں ہر اچھی بات کے بعد میری ناک اور آنکھوں سے زکام ٹپکنے لگتا ہے۔"

میں میمونہ کو پا کے مسرور رہوا۔ ایک اچھی شریک حیات پانے کے بعد آدمی خود کو مکمل محسوس کرتا ہے۔ لیکن میں اسے نہ پاسکا۔ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ میں جب اس کے باپ کے سامنے گیا تو انہوں نے کہا۔

"میاں تم دس ہزار روپئے کی کلرکی کرتے ہو۔ کار تمہاری لیے خواب ہے۔ اسکوٹر تم زندگی بھر کما کے بھی حاصل نہیں کر پاؤ گے۔ ایک جدید تر سائیکل حاصل کرنا بھی تمہارے لیے بہت مشکل ہے۔ پھر یہ بتاؤ میں اپنی لڑکی کا ہاتھ ایسے آدمی کے ہاتھ میں کیسے دوں۔"

میں نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ زندہ رہنے کے لیے نہ تو کار کی ضرورت ہے نہ ہی اسکوٹر کی لیکن وہ کہتے رہے کہ زندہ رہنے کے لیے صرف دو وقت کی روٹی نہیں چاہیے۔ زندگی کی آسائش چاہیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں زندگی کی ہر بازی ہار جاتا ہوں۔

چند دنوں تک میں اس سوچ میں مبتلا رہا کہ مجھے ایمان کو سینے سے لگا کے کیا ملا؟ دس ہزار کی کلرکی، میمونہ کی جدائی۔ لیکن آدمی کب تک سوچ میں بھی پڑا رہے۔ ایک بار پھر میں زندگی کے دائرے میں مصروف ہو گیا۔ ان دنوں میں دوسری جگہ تھا جب میمونہ کی شادی ہوئی۔

چند آنسو بہالیے۔ پھر اپنی بے کیف زندگی میں مست ہو گیا۔ تین سال بعد جب اپنے شہر واپس آیا تو گلی کوچوں کو پہچان نہ پایا۔ نہ اپنے دوست فاروق کو۔ جو بہت امیر بن گیا تھا۔ جس کا اخبار اب ہزاروں میں فروخت ہوتا تھا اور جس کے پہلو میں میمونہ لچکتی مسکراتی ہوئی چلتی تھی۔

اب مجھے اس بات پر تعجب نہ ہوگا اگر میں اپنے ضمیر کو کسی چوراہے پر نیلام کروں لیکن شاید اس دفعہ کوئی خریدار بھی نہیں ملے گا۔

# وارث کی تلاش

''اپنی نگوڑی قسمت ہی ایسی ہے۔'' پان دان سے پان اٹھاتے ہوئے چھوٹی بیگم نے اپنی بوڑھی نوکرانی سکینہ سے کہا۔ سکینہ نے پان دان کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا۔

''ابو بیگم صاحبہ آپ کو اس بات کا علاج کرنا چاہیے۔''

''کتنا بھی سوچو اس کمبخت نگوڑے دماغ میں کچھ نہیں آنا۔''

چھوٹی بیگم چھپر کھٹ پر اوندھی لیٹ گئی۔ سکینہ فکر مند تھی۔ اس نے کہا۔

''یہ نواب غازی الدین ہے نا....... آپ کے آنے سے پہلے ایک دن بڑی بیگم سے کہے کہ نکو نکو میرے کو معاف کر دیو تب آپ آئیں۔ پاشا آپ کے پاس آنے لگے۔ لیکن بچہ نہیں ہوا۔ پاشا کا نام لیوا نہیں آیا....... کہیں پھر کسی دن آپ کو نکو نکو کہے۔

میرے کو معاف کر دیو....... پھر تیسری بیگم آئے گی...... ایسا موقع نہیں آنا چاہیے۔''

سکینہ ٹھیک کہتی تھی۔ نواب غازی الدین میلی قمیض کو بدلنے میں تھوڑی دیر لگا دیتے ہیں۔ لیکن بڑی سے چھوٹی بیگم لانے میں دیر نہیں کرتے۔ چھوٹی بیگم کو واقعی فکر لاحق ہوگئی۔ بیس میل دور گاؤں رتن پور کے ٹھیکیدار اپنے والد نواب علی خان کے پاس رہ کر خود تو بڑی ٹھاٹ سے پل کر جوان ہوئی تھی۔ پھر ان ہی دنوں نواب غازی الدین اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس کے گاؤں پہنچ گئے۔ چھوٹی بیگم کا صندل جیسا چمکتا ہوا چہرہ دیکھا کہ دل بے اختیار قابو سے باہر ہو گیا۔ نواب علی خان کو دل کا حال بیان کیا۔ نواب کی عمر ان دنوں تیس سال تھی۔ چھوٹی بیگم اٹھارہ سال کی تھی۔ لیکن نواب نواب تھے۔ بھلا پھر نواب علی خان کیوں رشتہ ہاتھ سے جانے دیتے۔ یہ وقت عجیب تھا۔ نوابوں کے نام پر سب کچھ نثار کرنے کے لیے لوگ تیار

رہتے تھے۔ لیکن اب تو دس سال ہو گئے اس شادی کو بھی۔ اب تک چھوٹی بیگم کی گود خالی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹی بیگم کی فکر رفع ہو گئی۔ نواب اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہہ رہے تھے۔

"کیوں چھوٹی بیگم ...... آج تمہارا چہرہ کیوں سوجھا ہوا ہے۔"

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

اس شام رمضان کوچوان کی بیوی ہاجرہ ایک لڑکی اپنے ساتھ حویلی میں لائی۔ حویلی کے قالینوں پر دونوں نے پھونک پھونک کے قدم رکھے۔ ہاجرہ نے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

"ام بیگم صاحبہ ایک بات بولنے آئی ہوں۔"

"کیا بات ہے ہاجرہ؟"

"اپنا چاچا مر گیا...... یہ لڑکی اپن کی بھتیجی ہے۔ صرف باپ کا سہارا تھا سو وہ بھی اٹھ گیا۔"

"اب اس بے چاری کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ قدموں میں پڑی رہنے دیجیے۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرے گی۔"

"کیا نام ہے اس کا۔"

لڑکی نے خود کہا۔

"شمع۔"

وہ اس دن سے نواب غازی الدین کی حویلی میں رہنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اپنے کام سے شمع نے حویلی میں رہنے والوں کا دل جیت لیا۔ چھوٹی بیگم کی نظر کرم شمع پر تھی۔ اس نظر کرم پر نوکروں کی پلٹن جلن سے مری جاتی تھی۔

بہار آئی۔ حویلی میں نئی چہل پہل نظر آئی۔ نوکر اور نوکرانیاں ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پاندان کسی کے ہاتھ میں گلدان، کسی کے ہاتھ میں چھپر کھٹ۔ نواب صاحب اپنے دوست عبدالصمد خان کے ساتھ شطرنج کھیلنے والے تھے۔ نوابی کوٹ پر آخری نظر

ڈال کر اپنا عصا سنبھال لیا۔ راہ داری میں دوڑتی ہوئی شمع سے ٹکر ہوئی۔ نواب صاحب کا عصا گر گیا۔

"... ہے کو اتنی بے سدھ دوڑی جاتی ہے۔"

... بند ہوگئی۔ شمع کا روپ بہار کے ساتھ کھل اٹھا تھا۔ نواب اس کا حسن دیکھ کر دنگ ... سے چند دن پہلے کی کمزور شمع نظر کے سامنے آگئی۔ نواب کو شطرنج کا کھیل یاد آیا۔ اس ... شمع سے کہا۔

"اب کاہے کو یہاں کھڑی...... جا...... جا۔"

شمع دوڑتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ دوسرے دن بیگموں کو بہار کے آنے کی خوشی میں شہر کے بڑے باغ میں جانا تھا۔ فٹن تیار تھا۔ نوکرانیوں کی قطار آخری چیزوں کو فٹن میں رکھ رہی تھیں۔ چھوٹی بیگم نے اپنا غرارہ دیتے ہوئے شمع سے کہا۔

"لے آج بہار آئی ہے نا...... پہن لے۔"

نہا کے جب چھوٹی بیگم کا دیا ہوا غرارہ شمع نے پہنا تو کسی بیگم سے کم نظر نہیں آتی تھی۔ شمع نیا لباس چھوٹی بیگم کو دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن جب وہ ان کے کمرے میں اجل ہوئی نواب وہاں ملے۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن نواب کی آواز نے اس کے پاؤں کو زنجیر پہنا دی۔

"ٹھہر۔"

شمع خود کو سنبھال رہی تھی۔ نواب نے باہر نظر دوڑائی چٹخنی لگائی اور شمع سے کہا۔

"اتنی خوبصورت تو چھوٹی بیگم بھی اس غرارہ میں نظر نہیں آتی۔"

لیکن بات صرف اس جملہ پر ختم نہیں ہوئی۔ بستر کی چادر پر شکن پڑ گئے۔ چٹخنی کھل گئی۔ چھوٹی بیگم نے شمع کے کھلے ہوئے بال دیکھے۔ اس دن شمع کہیں بھی نہ گئی۔ سر درد کا جھوٹ موٹ کا بہانہ بنایا۔ بے چاری جل رہی تھی۔ لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ حویلی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

چھوٹی بیگم شمع کے بدلتی ہوئے عادتوں کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دن شمع دوڑتی ہوئی غسل خانے میں گھس گئی۔ واپس آئی تو بیگم نے پوچھا۔

''تیرے کو کیا ہوا؟''

''ابکی آئی تھی۔''

''ابو.....تو..... پاشا کو بدنام کروگی۔ یہ سکینہ کہاں مرگئی ہے
شمع نے دوڑ کر سکینہ کو بلایا۔ سکینہ کو دیکھ کر چھوٹی بیگم نے کہا۔

''دیکھ......سکی.......اس کمبخت کو یہاں سے ہٹالے۔''
شمع نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایسی حالت میں، میں کہاں جاؤں۔''

''میرے کو نہیں معلوم'' پھر کچھ سوچتے ہوئے چھوٹی بیگم نے سکینہ سے کہا۔

''سکی تو اس کو میرے گاؤں کے پرانے مکان لے جا۔''

شمع اور سکینہ کے چلے جانے کے بعد پہلی بار اپنے آس پاس کی گھٹن کو چھوٹی بیگم نے ختم پایا۔ نواب کو یہ خبر ملی کہ شمع چلی گئی۔ اس لیے وہ ایک مدت کے بعد چھوٹی بیگم کے پاس چلے آئے۔ ایک دن صبح ہی صبح بیگم نے نواب غازی الدین سے کہا۔

''ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''کہو......کہو۔''

''میرا دل گاؤں جانا چاہتا ہے۔''

''کیوں.....آج تم کو گاؤں کی یاد کیسے آئی۔''

''کہہ دوں'' چھوٹی بیگم نے شرما کے کہا۔

''اے......کیا......بات ہے۔''

''چھوٹے نواب۔''

''اے'' نواب خوشی سے پھوٹ پڑے۔ ''اب تک ہم سے چھپا رہی تھی۔ نہیں..... نہیں.....ایسا کر کے تم نے غلط کیا......جشن ہوگا۔''

جشن بھی ہوا......اور......پھر چھوٹی بیگم گاؤں بھی چلی گئی......ایک صبح گاؤں سے ایک آدمی آیا۔ اس نے نواب سے کہا۔

"مبارک ہو نواب صاحب آپ کو بیٹا ہوا ہے۔"

اس دن سے چھونواب کیا سے کیا کر بیٹھے۔ خیرات، جشن، مشاعرے اور شطرنج کے کھیل کے بعد ... سوار گاؤں پہنچ گئے۔ بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے نواب نے چھوٹی بیگم سے کہا۔

"... اب تم بڑی بیگم ہوگئی ہو۔ بیٹا جو آ گیا۔"

چھوٹی بیگم کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بیٹا نواب کا ہی تھا۔ لیکن چھوٹی بیگم اس کی اصلی ماں نہیں تھی۔ اس نے تو صرف اس کو اس لیے بیٹا کہا تاکہ چھوٹی سے بڑی بیگم بن جائے۔

# نجلی

''نجلی.......میری پیاری نجلی.......تو چھوٹی ہے مگر خوبصورت ہے۔ جب مجھے تیری یاد آتی ہے تو سب کچھ یاد آتا ہے۔ تیرے سریلے اور میٹھے بول میری زندگی میں شہد گھول رہے تھے۔ تو مجھ سے کیوں روٹھ گئی۔ تو کہاں چلی گئی۔ تیرے لیے ہی تو میں نے زندگی کی خوشیوں سے منہ موڑا۔ ایک تو ہے جو مجھ سے روٹھ کے چلی گئی۔ یاد ہے نا......میری پیاری نجلی جب میں چھ سال کا تھا۔ میرے باپ نے تم کو میرے ہاتھ میں سونپ دیا۔ میں نے جب تم کو دیکھا تو خوشی سے چیخ پڑا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اسی دن میرا باپ مجھ سے جدا ہوا۔ پھر بھی میں خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ جب میں گاؤں کے سرسبز کھیتوں کو پار کرتے ہوئے ناگری پہاڑ پر پہنچ گیا۔ اس وقت جب تم کو اپنے منہ کے ساتھ لگایا۔ نہ جانے تم میں سے کیسے محبت بھرے پیار بھرے سریلے اور میٹھے بول نکلنے شروع ہوئے۔ مجھے تم سے لگاؤ ہوا۔ میں تم کو اپنی زندگی کا سریلا حصہ تصور کرنے لگا۔ جب میرا باپ مجھے اکیلا چھوڑ کے چلا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ تم نے میرے سارے غموں کو بھلا دیا۔ تم میری زندگی کی خوشی کا راگ بن گئی۔ تم نے مجھے جینے کے اصول سکھائے۔ اب میری زندگی کا سورج وہاں ہے جہاں غروب ہونے میں تھوڑی دیر ہے۔ پھر تم مجھ سے کیوں روٹھ کے چلی گئی.......عمر کے اس حصے میں مجھ سے اس طرح روٹھ کے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ جہاں اتنے سالوں ساتھ دیا۔ وہاں اور چند سال ساتھ دیتی تو میں اپنے آپ کو زندگی کے اس آخری دور میں اکیلا محسوس نہ کرتا۔ جب میں جوان تھا تیرے مدھر سروں نے دوشیزاؤں کے دلوں کو دھڑکنا سکھایا۔ ان کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ لیکن نہ تو نے کبھی ان دوشیزاؤں کے جذبات کی قدر کی۔ نہ میں نے کبھی

ان کی طرف دیکھا۔ آج تک تو شہر کی بھیڑ میں نہ کھوئی۔ پھر اچانک کیوں غائب ہو گئی۔ نجلی...... تیرے جانے کے بعد مجھے اپنی ساری زندگی کے واقعات کیوں یاد آتے ہیں۔ وہ بوڑھا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اپنے گھر لایا کھلایا پلایا میری ذات اور جائداد کے بارے میں پوچھا۔ لیکن ایک دن اس کا آدمی میرے جھونپڑے میں گھس آیا۔ تو اس وقت میرے ساتھ تھی۔ وہ آدمی بوڑھے کے گھر سے رشتہ لایا تھا۔ میں نے منظور کیا۔ چند دنوں کے بعد میرے گھر میں تیسرا فرد بھی آگیا۔ اس رات نجلی تو نے اس خوشی میں مدھر راگ الاپے۔ تو بہت عرصے تک یہ سمجھتی رہی کہ جس طرح تجھ کو میرے کھردرے ہاتھوں سے پیار مل رہا ہے اسی طرح وہ نرم و نازک ہاتھ تیرے ملائم جسم کو پیار کریں گے۔ لیکن وہ عورت تیری دشمن نکلی۔ تمہارے لیے اس کے دل میں جلن پیدا ہوئی اور اس نے تم کو مجھ سے جدا کرنے کی کوشش کی۔

لیکن وہ بھول رہی تھی کہ میں سب کو بھول سکتا ہوں۔ سب کو اپنے آپ سے جدا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ نہ جانے وہ عورت کیسی تھی! اس نے کبھی پیار سے نہیں پوچھا۔ ہر بات میں تیراذ کر لے آتی۔ میں اس جھگڑالو عورت سے تنگ آ گیا تھا۔ تم نے مجھ سے بار بار یہ التجا کی کہ میرا ساتھ چھوڑ دو۔ لیکن میں خودغرض اور احسان فراموش نہیں تھا۔ میں یہ کیسے بھولتا کہ تم نے مجھے زندگی کی ہر گھڑی میں میرا ساتھ دیا۔ ایک دفعہ اس جھگڑالو عورت نے تجھے ضرر پہنچانے کی کوشش کی۔ میں نے اس عورت کو سب کچھ دے دیا۔ گاؤں کو چھوڑ دیا۔ اس جگہ کو چھوڑ دیا۔ جہاں میں نے اپنے کھیتوں کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ لیکن میں نے تجھ کو نہیں چھوڑا۔ میں دردر کی خاک چھانتا رہا۔ شہروں شہروں فٹ پاتھ پر سویا لیکن تو ہر وقت میرے ساتھ رہی۔ تو نے ہر وقت میرے غمناک دل کو فرحت اور تازگی بخشی۔ نجلی تو کہاں مرگئی۔ وہ سڑک سڑک ڈھونڈتا رہا۔ "نجلی او نجلی......" لیکن اس بوڑھے آدمی کی بات کون سنتا۔

ایک راہ گیر لڑکے نے کہا۔

"بابا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"بیٹا میری نجلی......!"

"وہ پرانی نجلی...... بہت پرانی نجلی۔"

"ہاں وہی نجلی....." بوڑھے کی آواز خوشی سے کانپنے لگی۔

لڑکے نے کہا۔
"اس کو پانچویں گلی والے شیام نے اٹھالیا۔"
"بیٹا مجھے اس کے پاس لے چلو۔"
"آؤ بابا۔"
وہ دونوں پانچویں گلی میں پہنچ گئے۔ لڑکا پکارنے لگا۔
"شیام.....او......شیام.....ذرا ادھر تو دیکھ۔"
شیام باہر آیا اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت تھی۔ شیام کے ہاتھ میں نجلی تھی۔ بوڑھا خوشی سے چیخ پڑا۔
"یہی تو میری نجلی ہے" لیکن عورت نے کہا "یہ نجلی تو میرے بیٹے کی ہے۔"
وہ اس کی جھگڑالو بیوی تھی۔ بوڑھے نے افسردہ آواز میں کہا۔
"نہیں یہ میری نجلی نہیں ہے۔" وہ یہ کہہ کر چل پڑا۔ لیکن وہ چیخنا چاہتا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔
"نجلی میری پیاری نجلی اب میرے پاس رہنے کا تجھے کوئی حق نہیں۔ تجھ کو شیام کے پاس ہی جانا تھا۔ کبھی تم کو میرے باپ نے مجھے سونپا تھا۔ وہ مر گیا۔ تو کیا؟......نہیں.......نہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا.......موت اتنی جلدی نہیں آسکتی۔" اس نے ایک تارے کو آسمان میں ٹوٹتے ہوئے دیکھا وہ چیخ پڑا۔
"نہیں......نہیں۔ میں شیام سے وہ نجلی چھین لوں گا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"
وہ دوڑنے لگا اور اس بھاگ دوڑ میں ایک لاری سے ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی لاش گندی سڑک پر پڑی تھی۔

# احساس کی بجلی

میں مر گیا ہوں۔ میرے جذبات احساسات اور خیالات مر گئے ہیں۔ مجھ میں جدو جہد کا جذبہ دم توڑ چکا ہے۔ جرأت جواب دے گئی۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن پھر بھی مر گیا ہوں۔ مردہ آدمی کی طرح میری زندگی بھی، بے حس، بے عمل اور بے رونق ہے۔ ایسے میں سوچتا ہوں۔

''میں مر گیا ہوں۔''

میری زندگی میں یہ جمود کیوں آگیا ہے؟ مجھ میں جذبۂ جدو جہد کیوں سرد ہو گیا ہے۔ مجھے یاد آیا جب مجھ میں زندہ رہنے کے لیے لاتعداد امنگیں موجود تھیں۔ جب میں ایک بوڑھی عورت کو اپنی دنیا سمجھ رہا تھا۔ میں بڑبڑایا۔

''وہ تو میری ماں ہے۔''

اس نے مجھے پالا پوسا اور ایک قوی ہیکل نوجوان میں تبدیل کیا۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی تو اس کو اپنا رفیق اور شفیق پایا۔ میں نے اس کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ ماں باپ بھائی اور دوست بنایا اور وہ بھی میرے لیے سب کچھ بن گئی۔ اچانک ایک دن وہ یہ سب رشتے توڑ کے چلی گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں پکارتا رہا۔

''ماں......ماں......ماں۔''

میری پکار سے وہ واپس نہ آئی۔ میں بے سود پکارتا رہا۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے میری کمر توڑ دی تھی۔ پھر میری زندگی کے تاروں میں ایک پرسوز نغمہ آ کر مل گیا۔ لیکن یہ نغمہ بھی بند ہو گیا۔ اس نغمے کا بھی گلا گھونٹ دیا گیا۔ جب مجھ سے یہ کہا گیا کہ بوڑھی میری ماں نہیں تھی۔

بوڑھی نے رحم کھا کے مجھے پالا پوسا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا ... میرا گلا گھونٹ دیا۔ مجھے قتل کر دیا۔ میرے جذبات احساسات خواہشات اور خیالات ... گیا۔ میں مر گیا اور میں چیختا رہا۔

"ماں....... ماں......تو نے مجھے زندہ کیوں رہنے ... زندہ ہو کے بھی مردہ ہوں۔ میرے لیے یہ زندگی اب وبال جاں ہوگئی۔"

زندگی میں پہلا سا جوش وخروش نہ رہا۔ وہ خوشی نہ رہی۔ وہ امنگ نہ تھی۔ ہم تو بس یہی سمجھ رہے تھے کہ زندگی ایک بوجھ ہے اور اس بوجھ کو بہر حال اٹھانا تھا۔ میں 'رتن سنگھ فارم' میں بطور سیلز مین کام کر رہا تھا۔ دن بھر لوگوں کو دیکھتا۔ اور ہر ایک کو اپنی ہی الجھن میں مبتلا پاتا۔ ہمارے مالک کو بھی الجھن تھی۔ یوں تو اس کے پاس لاکھوں روپے تھے، آسائش کے تمام سامان تھے۔ اس کی زندگی مزے سے کٹ رہی تھی۔ لیکن اس کو ایک بیٹی تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ایک بیٹا کیوں نہیں ہوا۔ اتنے بڑے کاروبار کو اس کے مرنے کے بعد کون سنبھالے گا۔ اس الجھن نے اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ وہ اکثر معمولی معمولی باتوں پر اپنے ملازموں پر برس پڑتا اور ایک میں ہوں جو اتنے بڑے حادثے سے دو چار ہوا۔ پھر بھی خاموشی سے سب کو دیکھے جا رہا تھا، مردہ ہو کر بھی زندگی کا بوجھ اٹھائے جا رہا تھا۔

ایک دن مجھے ایک گاہک کے گھر پر سامان دینا تھا۔ میں نے دے دیا۔ اس نے مجھے سو سو کے دس نوٹ دیے۔ ہزار روپے کو جیب میں لیے بس میں سوار ہوا اور واپس دوکان آ گیا۔ لیکن دوکان میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میری جیب کٹ گئی ہے۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں دوڑتا ہوا اپنے مالک کے پاس گیا اور خوف بھری آواز میں کہا۔

"مالک ہزار روپیہ گم ہو گیا۔"

سیٹھ رتن سنگھ مسکرا پڑا۔ اس مسکراہٹ میں گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔ پھر سنجیدہ آواز میں بولا۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو اشوک.....کہاں رکھے وہ ہزار روپے۔"

"مالک میں سچ بول رہا ہوں۔"

"حرامی...سچ اور جھوٹ کیا جانے؟"

اس کے اس جملے نے میرے صبر و تحمل میں آگ لگا دی۔

"سیٹھ جی آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

"آنکھیں دکھاتا ہے مجھے۔ نکل جا ابھی میری دوکان سے حرامی۔ گیٹ آؤٹ۔"

میں حرامی کی آوازوں کے شور میں دوکان سے باہر آ گیا۔ انتقام کی ایک عجیب سی آگ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں تڑپ رہا تھا۔ بار بار اپنے ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔ جیسے یہ ہاتھ رتن سنگھ کی گردن کو مسل دینا چاہتے تھے۔ لیکن میں کچھ کر نہ سکا۔

یہ قسمت کی بات ہی تھی کہ مجھے ایک کالج میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ امتحانات ختم ہوتے ہی لڑکے اور لڑکیاں نئے کلاسوں کے فارم بھر رہے تھے۔ میرے ذمے ایم.اے کے سال کے داخلہ فارم اور ان کی فیس تھا۔ میں ایک لڑکی کا فارم Check کر رہا تھا کہ میری نظر اس کے والد کے نام پر جم کے رہ گئی۔ اس کا والد سیٹھ رتن سنگھ تھا۔ میرے دل میں جذبۂ انتقام نے کروٹ لے لی۔ میں نے لڑکی کو بغور دیکھا جس کا نام سیتا تھا اس کا رنگ گندمی اور چہرہ کتابی تھا۔ بال نہایت لمبے اور کالے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

اس دن کے بعد میں اس لڑکی میں گہری دلچسپی لینے لگا۔ میں نے اس کے حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھی۔ وہ سب سے الگ اور جدا رہتی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ کوئی گھل مل نہیں پاتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کو کالج کے میدان میں ایک تنہا قد آور درخت کے نیچے روتے ہوئے پایا۔

"آپ روتی کیوں ہیں؟"

اس نے میری طرف خالی خالی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے یہ کہنے آئے ہیں کہ اب مجھے رونے پر بھی اختیار نہیں ہے۔"

"آپ نے مجھے غلط سمجھ لیا۔"

"ہاں میں تو سب کو غلط سمجھ رہی ہوں....کہو.....میری ماں کی طرح کہ میں نے اپنے

باپ نے غلط سمجھ لیا۔ میرے باپ کو یہ دکھ ہے کہ میں بیٹی بن کر کیوں آئی بیٹا بن کر کیوں نہیں آئی۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"سیتا آپ پڑھی لکھی ہو۔ کسی کی بات پر کان مت دھرو۔ جیو اور پیار سیکھ لو۔"

سیتا نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"لیکن کون مجھ سے پیار کرے گا۔ جس لڑکی کو اپنے باپ سے پیار نہیں ملا۔ اس کے ساتھ کون پیار کرے گا۔"

"تم احساس کمتری میں مبتلا ہو۔"

"ایک بات بتاؤں..... خفا نہ ہونا۔"

"میں خفا نہیں ہوں گی۔"

میں نے جرأت کرتے ہوئے کہا۔

"سیتا میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

میرا یہ جملہ سن کے اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ میں جان گیا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ یوں تو میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن دل کے اندر انتقام کی آگ موجزن تھی۔

سیتا کو پیار نہیں ملا تھا نفرت ملی تھی۔ وہ پیار کی بھوکی تھی، متلاشی تھی۔ وہ پیار میں نے اس کو دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اتنے قریب کہ گماں نہیں ہوتا تھا کہ ہم کبھی جدا بھی ہوں گے۔ وہ دن میں کیسے بھول جاؤں جب میرا انتقام پورا ہوا۔ جب سیتا نے اپنا سب کچھ میرے حوالے کیا اور میں نے ہنس ہنس کے اس کا سب کچھ لوٹ لیا اور اپنے جنون کو داد دی۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس سے دور ہو گیا۔ وقت کے ساتھ ہم دونوں کے تعلقات کٹ کے رہ گئے۔

ایک دن میں جب کالج سے لوٹا، سیتا کو اپنے گھر کے دروازے پر پایا۔

"تم"

"ہاں اشوک میں ہوں۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''کیوں آئی ہو؟''

''اشوک میں تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم کیوں بدل گئے۔ میں نے پیار کے نام پر اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کیا۔ لیکن تم بے وفا کیوں بن گئے۔ مجھے لوٹ کے جفا کا دامن کیوں تھام لیا۔ میں آج اپنے ماں باپ کے گھر کو خیر باد کہہ کے آئی ہوں۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سیتا میرے پاس تمہاری بہکی بہکی باتیں سننے کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

سیتا غصے سے چیخ پڑی۔

''یہ تم کہہ رہے ہو اشوک......تم......اشوک میں ماں بننے والی ہوں۔''

میں نے خوشی سے قہقہہ لگایا۔ میرا انتقام پورا ہوا تھا۔ میں چیخ پڑا۔

''جا کر سیٹھ رتن سنگھ سے کہو کہ اس کی بیٹی کی کوکھ سے حرامی بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ پھر دنیا کہے گی رتن سیٹھ کا پوتا حرامی ہے..... ہا...... ہا.....انتقام.....''

میرے قہقہے کو محلے کے لنگڑے بابا نے خاموشی میں تبدیل کیا۔ وہ کہہ پڑا۔

''کیوں ہنس رہے ہو اشوک.....شاید اس لیے کہ ایک حرامی بچہ مندر کی سیڑھیوں پر ملے گا۔''

میرے ذہن پر احساس کی بجلی گر پڑی۔ دوسرے لمحے میں نے سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو اپنے گھر کے اندر لے آیا۔

# وہ ہار گیا

"ہنری"

"کہو ہیلن"

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"تم نے پہلے بھی مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔"

"آج پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہنری۔"

ہنری کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے شراب کا گلاس ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"انگریزی شراب پی رہا ہوں۔ تمہارے ملک کی شراب ہے۔ بہک جاؤں تو میرا قصور نہیں۔"

ہیلن صوفے سے کھڑی ہوئی اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہارے ملک کی سگریٹ پیتی ہوں۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو، تم ائرفرانس میں کام کرتے ہو۔ میں انگلینڈ کے سفارت خانے میں ملازم ہوں۔ میری اور تمہاری ملاقات اشوکا ہوٹل کے بار روم میں ہوئی یاد ہے تم کو! ہنری شراب کا پیگ غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے سارا انگلینڈ اس میں ڈوب گیا ہو۔ ہیلن نے کہا۔

"تم باتوں کو بہت جلد بھول جاتے ہو یہ تمہاری بری عادت ہے۔ بھول گئے کہ ہم دوسری بار کتب مینار کے باغ میں ملے۔ یہاں تم نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں نے تمہاری محبت کو منظور کیا۔ پھر ہم نے کشمیر آنے کا پروگرام بنایا۔ اس لیے اس وقت

سڑک جا رہی ہے

ڈل جھیل کے ہاؤس بوٹس ہیں اور تم سے یہ سوال کرنے سے پہلے میں نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

ہنری گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"شاید میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"شاید کیوں۔ کل ہی تم نے مجھ سے نشاط باغ میں زلفوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو۔"

ہنری نے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"کل کی باتیں میں اکثر بھول جاتا ہوں۔ نہ جانے کیوں؟"

"کون کل کی باتیں یاد رکھتا ہے جس نے کل کی باتیں یاد رکھی وہ گم ہو جاتا ہے اپنے آپ میں۔ کل جو میں نے تم سے کہا تھا وہ کل کی بات تھی آج میں سوچ رہا ہوں...... کیوں نا...... میں ایک کشمیری لڑکی سے شادی کروں۔ اس کشمیری لڑکی سے جو لمبے گون جیسے کپڑوں میں اپنے خوبصورت جسم کو لپیٹے رکھتی ہو۔ جس کا چہرہ غازے کی لمبی لمبی بانہوں کے نیچے پوشیدہ نہ ہو۔ جس کے ہونٹ سرخ لپ اسٹک کے نیچے اصل رنگ نہ کھو بیٹھیں۔ جو کشمیری کلچر کی صحیح ترجمان ہو۔"

ہیلن نے اس بات پر یقین نہ کیا۔

"تمہیں تو مذاق کرنے میں ہر وقت لطف ملتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم باتیں بنانے میں ماہر ہو۔ پھر تو فرانس کے لوگ ان ہی مذاقوں میں زندگی کے دن کاٹ لیتے ہوں گے۔"

"انگلستان کے لوگ ہر بات کو سیاسی انداز میں دیکھتے ہیں اور ہر بات کو سیاسی ہنر بازی سے جیت لینا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ کسی بھی ہنر بازی سے تبدیل نہیں ہوگا۔"

ہیلن نے سگریٹ ایش ٹرے پر رکھا۔

"فرانس کے لوگ وعدوں کو بھول جاتے ہیں۔ اچھا نہیں کرتے۔"

"اچھا کون کرتا ہے۔ یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میرا دل

ایک بلبل کی طرح ہے۔ جو باغ میں اس لیے کھو جاتا ہے کہ اس کو معلوم نہیں کس پھول کی ٹہنی کو اپنا سہارا بنائے گا۔''

ہنری نے کیمرہ گلے میں لٹکایا۔ ہیلن نے کہا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''وہ دیکھو'' ہنری نے ڈل گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ جو دوکانیں ہیں وہاں کشمیری ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں کو فروخت کرتے ہیں۔ مجھے ایک کشمیری لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ مجھے ان چیزوں کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے۔

ہنری ہاؤس بوٹ سے باہر آ کر ایک شکارا میں سوار ہوا آخر وہ فرانس کا رہنے والا تھا۔ جہاں کبھی نپولین بوناپارٹ حکومت کرتا تھا جس دھرتی پر روسو اور والٹیئر نے جنم لیا۔ جس دھرتی نے ایک ایسا انقلاب دیکھا جس نے روایتوں کو چکنا چور کر کے رکھا۔ اس لیے ہنری ہر بات میں کوئی نکتہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ وہ ایک دوکان میں داخل ہوا۔ دوکاندار نے کہا۔

''حکم کیجیے آپ کو کیا چاہیے؟''

''میں خود بھی کسی کسی وقت یہ سوچتا ہوں کہ مجھے دراصل کیا چاہیے۔ لیکن اب تک معلوم نہ ہوا۔''

''آپ کو وہ چاہیے جو دلکش ہو دلفریب ہو۔ یہ قالین دیکھئے حضور اس کا اون آسٹریلیا سے آیا ہے۔ پھر بھی اس پر کشمیر چھایا ہوا ہے اس دلفریب ڈیزائن کو ہم نے شالیمار کا نام دیا ہے۔ آپ شالیمار باغ میں جائیں۔ اس کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک دیکھ آئیں۔ آپ کو وہاں یہی پھول ملیں گے جو اس قالین کے ڈیزائن میں موجود ہیں۔ یہ اس کشمیری کے ہاتھ کا بنا ہوا قالین ہے جو دن بھر میں صرف دو سو روپے کماتا ہے جس کے گھر میں اب بھی افلاس منہ کھولے ہوئے ہے۔ جو زندگی بھر قالین کے تاروں کو کھینچتے کھینچتے اپنی زندگی کی تاروں کو کھینچنا بھول جاتا ہے۔ یہ قالین امریکہ، لندن، پیرس، آسٹریلیا اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے شاندار گھروں کی زینت بنتا ہے۔''

''تو پھر میں بھی ایک قالین خریدوں گا۔ شالیمان کو میں اپنے ساتھ لوں گا۔ الگ رکھو

اس قالین کو۔ دوکاندار کے ہاتھ میں اب کشمیری شال تھا۔

"جناب یہ کشمیری شال ہے۔ اس پشمینہ کی شال کا اون لداخ سے آتا ہے۔ کشمیر کے لوگ اس اون کو بنتے ہیں۔ پھر ایک مصور کی طرح اپنے ہاتھوں سے نقش ونگار پھیلا دیتے ہیں، اس نقش ونگار میں حقیقی زندگی نظر آتی ہے۔"

"[illegible] تی ہے۔" ہنری نے شال کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس شال پر بنے ہوئے پھول کشمیری لڑکیوں کی طرح ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ کتنی محنت کرنی پڑتی ہوگی اس شال بننے والے کاریگر کو۔ یہ شال بھی لوں گا۔ اس شال کو بھی الگ رکھو۔"

اب دوکاندار کے ہاتھ میں پیپر ماشی کا گلدان تھا۔ دوکاندار نے کہا۔

"یہ پیپر ماشی کا گلدان ہے اس پر جو انسانی ہاتھوں نے جانور بنائے ہوئے ہیں یہ سب جانور کشمیری جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ دیکھئے قدرت کے اس جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے عشق اور حسن۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ وہ تمام عالم سے بے خبر ہیں۔ مونا لیزا کی طرح اس پیپر ماشی کے گلدان کی قیمت لاکھوں روپئے نہیں۔ یہ گلدان تو صرف تیس روپئے کا ہے۔"

ہنری چونک پڑا۔

"اتنا سستا۔ کیا ہوا ہے تم کشمیریوں کو جو اپنی چیزوں کو اس طرح اونے پونے داموں میں فروخت کرتے ہو...... قدر کرو اپنے فن کی۔ میں اس گلدان کو بھی لے رہا ہوں۔ دوکاندار جانتے ہو میں ایک کشمیری لڑکی سے شادی کروں گا۔ وہ جب اس کشمیری قالین پر بیٹھے گی اور یہ کشمیری شال اوڑھے گی، اپنے ہاتھوں سے اس پیپر ماشی کے گلدان میں پھولوں کو رکھے گی تب مجھے محسوس ہوگا کہ سارا کشمیر میرے گھر میں سمٹ آیا ہے۔ میں ابھی پیسے لے کر آتا ہوں۔"

"جلدی آیئے گا کہیں کوئی دوسرا ان چیزوں کو نہ لے جائے۔"

"میں آتا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔"

ہنری شکارا میں سوار ہو گیا۔ ملاح نے چپو پانی میں ڈالا۔ شکارا مدھم رفتار کے ساتھ

آگے بڑھنے لگا۔ ہنری نے شکاراوالا سے کہا۔

''تیز چلاؤ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

شکاراہاؤس بوٹ کے پاس رک گیا۔ ہیلن نے ہنری کو دیکھتے ہوئے کہا

''تم کہاں رہ گئے تھے؟''

''میں کشمیر کی چیزیں خرید رہا تھا۔ اس کشمیری لڑکی کے لیے جس کے ساتھ میں شادی کروں گا۔''

''تم نے فیصلہ کر لیا کہ تم کشمیری لڑکی سے شادی کرو گے۔''

ہیلن نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ہنری نے اپنے سوٹ کیس سے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

''اب اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ مجھے جلدی ہے اس لیے جا رہا ہوں۔''

ہیلن نے کچھ نہ کہا۔ وہ ہنری کو دیکھ رہی تھی جس میں نہ جانے کون سا جذبہ امنڈ آیا تھا۔ ہنری شکارا میں سوار ہوا۔ ہیلن کو محسوس ہوا کہ وہ اس سے بہت دور چلا گیا۔ لیکن ہنری ایک نئی خوشی میں سرشار تھا۔ اسی خوشی میں دوکاندار کے پاس پہنچ گیا۔

''میں پیسے لے آیا۔ میری من پسند چیزیں مجھے دے دو۔''

دوکاندار نے کہا۔

''افسوس میں نے ان کو فروخت کر دیا۔''

ہنری ہار گیا۔

# جوا

اس نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ جوے کو جس نے ہاتھ لگایا اس کی زندگی تباہ و برباد ہوگئی۔ وہ شوپیاں کے علاقے میں پیدا ہوا۔ وہیں پل کر وہ جوان ہوا۔ اس سادہ لوح کسان نے بچپن سے جوانی تک کئی حادثات دیکھے۔ والد صاحب نے اس کو دس سال کی عمر میں بیس کنال زمین دے کر دنیا سے رخصت لی۔ والدہ نے اس کو بیوی کی ذمہ داری سونپ کے اس دنیا کو چھوڑا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ بس! وقت نے عبدالغفار کے کندھے پر اس قدر ذمہ داریوں کا بوجھ رکھا کہ گاؤں سے باہر کی دنیا دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے خود بھی یہ دنیا دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

آج تک وہ اپنے کھیتوں میں ہل چلاتا رہا۔ کھیتی کرتے ہوئے وہ ایسی خوشی محسوس کرتا جیسے کوئی مقدس کام انجام دیتا ہو۔ اناج اگانا تو مقدس کام ہی ہے لیکن وہ تو صرف اپنے پیٹ کے لیے کھانا اگا سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنا ہی تھا۔ ہاں ایک خوشحال گھر اس کے پاس ضرور تھا اور کیا چاہیے۔ اس کی بیوی نیک عورت تھی۔ جس نے چار سال پہلے ایک بچہ کو جنم دیا تھا۔ عبدالغفار نے ارادہ کیا تھا کہ جب اس کا بچہ چار سال کا ہوگا تو وہ شہر جا کے حضرت بل درگاہ شریف کے آستانہ پر اکیس سو روپے نذرانۂ عقیدت چڑھائے گا۔ بچہ چار سال کا تھا۔ اکیس سو روپے اس کے پاس نہیں تھے۔ اس نے اپنے گاؤں کے گنائی شعبان کو گھر آنے کو کہا تھا۔ وہ اپنا ایک بھیڑ شعبان قصاب کو فروخت کر کے چار پانچ ہزار روپیہ حاصل کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ شہر کا رخ کر سکے۔

وہ اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آؤ شعبان اندر آؤ۔''

تمباکو کے دو تین کش لے کر اس نے حقہ غفار کے سامنے رکھا۔

''ہاں بھئی مجھے کیوں ملایا؟ خیریت تو ہے۔''

''شعبان مجھے ایک بھیڑ فروخت کرنی ہے۔''

''چلو.....بھیڑ کو دیکھ آئیں۔''

وہ دونوں اکٹھے مویشی خانے میں داخل ہوئے۔ گھاس سے [illegible] ئے کمرے میں دو بیل تھے جو اس کے ساتھ کھیت میں کام کرتے تھے۔ ایک گا[illegible]ھی تھی جو اس کے اکلوتے بیٹے کو اپنا سفید دودھ دے کر اس میں نئی قوت بھر دیتی تھی۔ ایک بھیڑ تھا جو وہ آج اپنے بچے کی چوتھی سال گرہ پر قربان کر رہا تھا۔ شعبان نے بھیڑ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا وزن زیادہ سے زیادہ ۱۵ سیر ہوگا۔'' حالانکہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ عبدالغفار نے کہا۔

''جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔''

''دیکھو بھائی میں اس کے ۳/ ہزار دے سکتا ہوں۔''

''کیا کہتے ہو شعبان بھائی۔'' اس نے حیرانی سے کہا۔

شعبان نے بھیڑ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی میں زیادہ سے زیادہ چار ہزار دے سکتا ہوں۔''

عبدالغفار چاہتا تھا کہ شعبان چار کے پانچ ہزار کرے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

۵۰/روپئے اس کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن شہر تک پہنچنے کے لیے ۵۰ روپئے خرچ کرنے ہی پڑیں گے۔ ۵۰/روپئے چلے گئے اب تو اس کے پاس ۲۵۵۰/روپئے رہ گئے۔ ہر میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اپنے آپ میں ایک نئی تبدیلی پا رہا تھا جیسے پہلی بار زندگی سے آشنا ہو رہا ہو۔ وہ ایک ایسی زندگی سے ہمکنار ہو رہا تھا جس میں مسرت آمیز نغمے سنائی دے رہے تھے۔

امیرا کدل کی اونچی اونچی عمارتوں نے اس کو حیرانی کے سمندر میں ڈبو دیا۔ یہاں اس

کو اپنے گاؤں کی کوئی گھاس کی جھونپڑی نظر نہیں آئی۔ یہ تو سرینگر کا امیرا کدل تھا۔ یہ تو بڈشاہ پل تھا۔ جہاں پر رنگین ہوا میں لہراتے ہوئے سائے اس کو نئی تہذیب کا راگ سنا رہے تھے۔

"حضرت بل درگاہ شریف کون سا راستہ جاتا ہے۔"

کسی نے اپنے ہم جماعتوں کو جمع کر کے ان سے کہا۔

"دیکھو..... دیکھو اتنا بڑا آدمی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ حضرت بل کون سا راستہ جاتا ہے۔"

وہ سب قہقہے لگانے لگے۔

ریزیڈنسی روڈ کی دوکانوں میں سجے ہوئے کشمیری قالین..... کشمیر کے روشن مستقبل کی ضمانت دیتے تھے۔ ڈل گیٹ کا راستہ ڈل جھیل کی طرف جا رہا تھا۔

وہ گاؤں کا رہنے والا تھا اور مصنوعی چیزوں سے زیادہ قدرت کے نظارہ میں کھونے کا عادی تھا۔ ڈل جھیل تو اس کے لیے دلچسپی کا سامان تھی۔ وہ کھو گیا..... قدرت کی حسین جھیل کی گہری خاموشی اور سکون میں۔ کسی آواز نے اس کا سکون منتشر کیا۔

"دس کے بیس..... بیس کے چالیس بناؤ۔"

جس آدمی کی یہ آواز تھی اس کے پاس تین تاش کے پتے تھے۔ تاش کیا ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس کے دل نے کہا کہ یہی تو جوا ہے۔ فوراً اس کی زبان پر آ گیا۔

"یا خدا ان لوگوں پر لعنت۔"

لیکن وہ آواز ہر لمحے کے بعد تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ جو اس کو ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ وہ کھڑا ہوا۔ کسی نے اس کے کان میں کہا۔

"اگر دس کے بیس بن جائیں پھر بیس کے چالیس اور چالیس کے اسی ہوتے ہوئے اس سے زیادہ بھی بن سکتے ہیں۔"

تب!

تب وہ اپنی بیوی کے لیے چاندی کی اصلی پازیب خرید سکتا ہے جو اس کی بیوی کے لیے تحفہ ہو گی۔

ایمان ہاتھ سے جانے لگا۔

رات کی سیاہی پھیلنے لگی۔ ایسی سیاہی میں وہ بھول گیا کہ ... جس نے ہاتھ لگایا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اس نے دس لگائے تو بیس واپس آئے۔ اس ... یا اگر بیس آئے تو چالیس بھی آسکتے ہیں۔

''اگر میں چالیس لگاؤں تو کتنے واپس آئیں گے۔''

''اسی۔''

''اسی۔''

زندگی میں پہلی بار وہ کسی کے جھانسے میں آگیا اور اس جھانسے میں اس نے چالیس روپے کھو دیے۔ چالیس چلے گئے تو کیا ہوا؟ ابھی تو اس کے پاس چادر تھی۔

''اپنی چادر داؤ پر لگا دو۔''

''نہیں.....اس کو تو میری بیوی نے چھ مہینے کی سخت محنت کے بعد تیار کیا۔''

''قسمت بدل جائے گی۔''

اس کا ایمان پھر کشمکش میں پڑ گیا۔ چادر داؤں پر لگ گئی۔ چادر واپس نہ آئی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ اس نے تو کسی کی امانت میں خیانت کی تھی۔ لالچ بڑھتا گیا۔ دھیرے دھیرے درگاہ شریف کے ۲۱۰۰/روپئے داؤ پر لگا دیے۔

''اکیس سو روپئے۔''

وہ چیخ پڑا۔

''میرا بچہ۔''

اس کو محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ دوڑتا ہوا بٹہ مالو کے بس اڈہ پہنچ گیا۔ واپسی کے لیے۔

# ترک

میں نے جب اس کو پہلی بار دیکھا تو اس کے گورے چہرے میں کوئی خاص کشش نظر نہیں آئی۔ اس کو میں نے پہلی بار امیرا کدل کے بس اسٹاپ پر دیکھا۔ وہ اس دن نرس کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ رعناواری اسپتال میں ایک نرس کا کام کر رہی تھی۔ اس کا نام ریتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رعناواری کے اس دوکاندار سے معلوم ہوا۔ جو اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ موت کے سوا اس کو کسی اور کا انتظار نہ تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کا وہ زمانہ بھی اس کو یاد تھا جب دن بھر کی کڑی محنت کے بعد صرف کچھ آنے کماتا تھا۔ اب زمانہ بدل گیا۔ زمانے کے دستور بدل گئے لیکن ماضی کی کچھ یادیں اب بھی اس کے پاس محفوظ تھیں۔
میں ایک دن اس کی دوکان پر بیٹھا تھا۔ ریتا میری کو دیکھ کر اس نے ایک لمبی سانس لی اور کہا۔
"زمانہ بدل جاتا ہے اور کبھی کبھی ایسی کروٹ لیتا ہے کہ یقین نہیں آتا۔ دیکھو...... اس لڑکی کو دیکھتے ہو" اس نے ریتا میری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ بوڑھے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ چوبیس سال کی لڑکی انگریزی ماں اور کشمیری باپ کی پیداوار تھی۔ اس کے باپ کا نام رائے بہادر سیٹھ موہن لال تھا۔ وہ شخصی راج کا مانا ہوا رئیس تھا اسلام آباد، گاندربل اور سوپور میں اس کے کھیت تھے۔ یہ سب کھیت اس کے حصے میں جاگیر دارانہ نظام کی برکت سے آئے تھے۔ اس لڑکی کی ماں کا نام لیڈی موہن ہیلن تھا۔ موہن لال اور ہیلن کی شادی ۱۹۳۰ میں ہوئی اور ۱۹۳۵ میں ریتا میری پیدا ہوئی تھی۔ ریتا میری کو ریتا کا لفظ اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ زمانہ کب رفتار بدل دے گا کیا معلوم۔ نازوں سے پلی ہوئی ریتا میری کو کب یہ خیال آیا ہوگا کہ کل وہ ایک معمولی نرس بن کے رہ جائے گی۔ موہن نے جس

طرح زمانے سے اپنا نقلی خطاب رائے بہادر حاصل کیا اور مہاراج کی خوشنودی سے کھیت حاصل کیے۔ زمانے کے تیور بدلنے کے ساتھ ہی وہ کھیت ہاتھوں سے نکل گئے۔ موہن لال جیسے کمزور انسان کے لیے یہ عظیم صدمہ تھا۔ جسے وہ برداشت نہ کرسکا اور [illegible] دنیا سے چلا گیا۔ ہیلن ان دنوں پینتیس سال کی عورت تھی جو اب بھی جوان لگتی تھی اور مردوں کو انگلیوں پر نچاتی تھی۔ وہ موہن سے زیادہ اس کی بڑی اسٹیٹ سے محبت کرتی تھی جب اسٹیٹ ہی چلی گئی تو اس کے لیے کیا رہ گیا تھا۔ جو وہ یہاں رہتی۔ موہن لال کی جو تھوڑی بہت جائیداد تھی اس کو اونے پونے داموں میں فروخت کیا۔ بارہ سال کی ریتا میری اس کے لیے بوجھ تھی۔ جب کبھی اس کی نظر ریتا میری پر پڑتی وہ بڑبڑاتی۔

''موہن لال نے مجھے اس بوجھ کے سوا اور دیا ہی کیا۔''

وہ لندن جانا چاہتی تھی جہاں اب بھی نہ جانے کتنے نوجوان اس کا انتظار کرتے تھے۔ لندن سے اکیلی آئی تھی اور اکیلی ہی واپس جانا چاہتی تھی۔

ریتا میری کو اس نے موہن لال کے ایک رشتہ دار کے پاس یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

''جب مجھے رہنے کے لیے معقول جگہ ملے گی تو میں ریتا کو لندن بلالوں گی۔''

لیکن بارہ سال ہوئے اب تک نہ اس کی طرف سے کوئی پیغام آیا نہ اس نے کبھی ریتا میری کو لندن بلایا اور اس طرح کل کی امیرزادی ایک اسپتال میں نرس ہوگئی۔

یہ تھی ریتا میری کی کہانی جس کی وجہ سے میں اس کے چہرے کو اسکول کے بس اسٹاپ پر دوسری بار غور سے دیکھنے لگا۔ نہ جانے اس کی نیلی آنکھوں میں مجھے کیسی گہرائی نظر آئی جس میں میں خود کو ڈبو دوں کہ مجھے اپنی کچھ خبر نہ رہے۔ زندگی میں پہلی بار میں اس قدر جذباتی ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے عشق کی دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہو۔ لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔ میں نے تو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ نہ جانے اس زبان کو کیا ہوا جو ریتا سے چار پانچ بار امیرا کدل کے بس اسٹاپ پر ملنے کے بعد اتنا کہہ سکی۔

''آپ رعناواری اسپتال میں کام کرتی ہیں۔''

''جی ہاں۔''

اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں اکاؤنٹس آفس میں کام کرتا ہوں۔ میرا نام رمیش ہے۔ تیس دن فائلوں میں سر کھپا کے صرف [illegible] روپئے ملتے ہیں۔ آپ کا کیا نام ہے؟"

"ریتا [illegible]۔"

پھر [illegible] جواب۔ شاید حالات نے اس کو اس رنگ میں تبدیل کیا تھا۔ لیکن میں اس کو بھولنے کے لیے [illegible] نہیں تھا۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ جو میں اس کے سامنے بیان نہیں کر پایا خط کے ذریعے بیان کروں گا۔

پیاری ریتا میری۔

میں تمہاری لیے کوئی اجنبی نہیں۔ امیرا کدل کے بس اسٹاپ پر ہم ایک دوسرے کو چار پانچ بار ملے۔ میں وہی رمیش ہوں جو اکاؤنٹس آفس میں کام کرتا ہے۔

بہت دنوں سے میں یہ بات تم سے کہنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا مگر میری زبان تمہارے سامنے ساتھ نہیں دیتی تھی۔

آج میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تم اس غریب نوجوان کی محبت کو قبول کروگی اور میری ہم سفر بنوگی۔ میں نشاط باغ میں شنیوار کو گیارہ بجے صبح سے شام کے چھ بجے تک انتظار کروں گا۔ امید ہے کہ تم ضرور آؤ گی۔

تمہارا صرف تمہارا

اشوک

شنیوار آنے تک ایک ایک لمحہ میرے لیے ایک ایک سال کے برابر گزرا۔ اس دن مجھے محسوس ہوا کہ نشاط باغ کی رنگین فضائیں مجھے مست کر رہی تھیں۔ اس کے فوارے میرے دل کو محبت کا ایک نیا راگ سنا رہے تھے۔ شاید نشاط کی بہاروں میں شوخی چھا گئی تھی کیونکہ میری ریتا آنے والی تھی۔ آخر......وہ آگئی لیکن اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اسکی نیلی آنکھوں میں ایسی کوئی چمک نہیں تھی جو مجھے ڈوب جانے کے لیے کہے۔ میں نے کہا۔

"میرا پیار آ گیا۔"

''نوجوان تم غلط سوچ رہے ہو۔ مجھے اپنے خیالوں میں تحلیل نہ کرو۔ میرے ساتھ اپنی زندگی کے حسین خواب مت جوڑو۔ تمہارا اور میرا راستہ الگ الگ ہے۔ یہ راستے کہیں بھی نہیں ملیں گے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''کیوں؟..... تم کیوں چونک پڑے۔ رمیش میں گورے نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں لندن میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اس ملک سے دور بہت دور اپنی بستی بسانا چاہتی ہوں۔ اس ملک کے لوگ بہت جلد یہ بھول گئے کہ میں ایک رئیس کی بیٹی تھی۔''

''نہیں میری۔ تمہیں تو دراصل تمہاری ماں بھول گئی۔''

''مجھے تو سب ہی بھول گئے۔'' وہ غصے میں چیخ پڑی۔ ''میں لندن جاؤں گی اور جاؤں گی۔''

وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ مگر وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ زمانے کے دیے ہوئے زخم اس سے کہلوا رہے تھے۔

زندگی میرے لیے بے لطف ہوگئی۔ جس کو چاہا اور دل کی دنیا میں بسالیا تھا اس کے واپس آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میرے دوست اکثر مجھ سے کہتے تھے۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں۔''

میں نے سکون حاصل کرنے کے لیے ایک ستار خریدلیا۔ ستار کے مدھر راگ تھوڑی دیر کے لیے من کو بہلاتے تھے۔ ایک دن ستار بجاتے ہوئے آنکھیں بند کیے خوابوں کی دنیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب آنکھو کھولی سامنے ریتا میری تھی۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے سمجھا کہ میں کوئی حسین خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اس کی آواز نے میرے خیالات منتشر کیے۔

''اچھا ستار بجاتے ہو۔''

''شکریہ۔ تم یہاں کیسے آئی۔''

''میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ میری ماں نے لندن آنے کے لیے ایک ہزار پونڈ سفر کے خرچ کے لیے بھیج دیا ہے۔''

میر[illegible] نے [illegible] آواز میں کہا۔ "کیا تم مجھ سے یہ کہنے آئی ہو کہ لندن جا رہی ہو۔"

ر[illegible] پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"[illegible] ایک ہزار پونڈ کا چیک واپس بھیج دیا اور لندن جانے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ میں تو اب [illegible] پاس آئی ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے گھر میں جگہ دو گے۔"

میر[illegible] [illegible]ران کن نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

# عورت اور مچھلی

وہ مچھلی جس کے جذبات میں گرمی ہو، جس کے جسم میں جوانی ہو وہ کب ہاتھ میں رہتی ہے۔ وہ تڑپتی ہے اور تڑپ کر پھسلتی ہے اور ہاتھ سے نکلنے کی کوشش میں محو ہوتی ہے.........مچھلی کے سڈول جسم کو دیکھ کر فوراً آدمی کے ذہن میں عورت کا سڈول جسم یاد آتا ہے۔ سکھی مچھیرن جب سمندر کے ساحل پر مچھلیوں کو اپنے برتن میں ڈالتی ہے تو بڑی ہمدردی کے ساتھ ان مچھلیوں سے کہتی ہے۔

"بے چاریاں۔"

اکثر سکھی مچھیرن ان مچھلیوں کو دم توڑتے دیکھتی اور ایسا کر کے خوش ہوتی۔ شاید اس لیے کہ وہ عورت ہے اور عورت ہو کر کسی سڈول جسم کو اپنے ہاتھ سے کچلنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہی کامیابی اس کی غیر معمولی خوشی کا باعث بن جاتی۔ سمندر میں کود کر ایک بڑی مچھلی بن کر چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے گداز جسموں کو اپنے منھ کا لقمہ بنانا چاہتی تاکہ ایک بار وہ بھی کہہ سکے۔

"مجھ میں طاقت ہے کہ میں بھی کسی کے سڈول جسم کو کچل سکتی ہوں۔"

یہ سب احساس کمتری کی بغاوت تھی۔ وہ ایک ہوش مند عورت تھی۔ کلورام کی آواز اس کے کانوں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

"ابھی تک بازار نہیں گئی۔ کیا بھوکا مرنا ہے......جا...... بازار جا۔ سب مچھلیوں کو فروخت کر کے آنا۔ ورنہ تیری خیریت نہیں ہے۔"

کلورام کے اس سلوک سے اس کو چڑ تھی۔ یہ سلوک جو اس کے ذہن کو اس بات پر

اکسار ہا تھا کہ وہ کلو رام بنے اور کلو رام سکھی مچھیرن۔

کلو رام اس کا خاوند تھا..... دس سال ہوئے جب ان کی شادی ہوئی۔ تب سکھی صرف چودہ سال کی تھی اور کلو رام بانکا نوجوان۔ مچھیروں کی چھوٹی سی بستی میں ہر مچھیرن اس کو اپنانے کے خواب دیکھا کرتی لیکن کلو رام کی نگاہوں میں چپکے سے سکھی آ کر بس گئی۔

سکھی کا باپ بڑا غصہ آور آدمی تھا۔ بھنگ پی کر ہر رات اناپ شناپ بکتا۔ سکھی اور اس کی ماں کو خوب پیٹتا۔ اپنے باپ کے اس انوکھے سلوک سے سکھی بہت تنگ تھی۔ ماں کہتی ''مردذات ہوتی ہی ہے ایسی۔''

''مرد..... مرد...... مرد۔'' سکھی کے ذہن میں یہ لفظ گونجتا تھا۔ اس کے لیے یہ سوال تھا۔

''مرد کیوں ہوتے ہیں ایسے؟''

لیکن کون اس کو جواب دیتا، جواب کے لیے صرف اس کے پاس اپنا ذہن تھا۔ وہ ذہن جو اس سے کہہ رہا تھا۔

''اس لیے کہ عورت عورت ہے اور مرد مرد۔''

مرد اور عورت کے نازک رشتے اس کے ذہن میں الجھن بن جاتے۔ اس کا ذہن مرد اور عورت کے دو سطحی لفظوں کو جانتا تھا۔ ہاں ایک بات ضرور تھی۔ نفسیاتی طور پر باپ کے غصے نے اس کو احساس کمتری سکھائی۔ پھر وقت نے اس کو مرد اور عورت کا رشتہ سمجھا دیا۔ جہاں ذہن کی گتھیاں سلجھ گئیں۔ وہاں مرد کے وجود سے وہ بھی نفرت کرنے لگی۔ یہ نفرت اس سے کہہ رہی تھی۔

''میں اگر ایک بار مرد کے روپ میں جنم لیتی تو......''

تو وہ غصہ آور باپ کے چہرے پر ایک گھونسہ رسید کرتی۔ وہ لہولہان ہو جاتا۔ لیکن کلو رام جب اس کو ملا تو اس کے خیالات تبدیل ہو گئے۔ ان بدلے ہوئے خیالات کے پس منظر میں ایک چنگاری تھی، ایک ایسی چنگاری جو نفرت کے ہر جال کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے۔ وہ ہے محبت...... ایک ایسی محبت جس کو دیکھ کے اس کے غصہ آور باپ کا سرخ چہرہ سفید ہو گیا۔ اس

سفید چہرے میں آتے ہوئے طوفان کی جھلک نظر آرہی تھی۔ یہ [illegible] آگ تھی۔ جس آگ نے سکھی کے باپ کو آگ بگولا بنا دیا۔ اور ایک بار سکھی پر اس [illegible] باپ کا قہر نازل ہوا۔ لیکن اس بار سکھی کو اس قہر سے کلورام نے بچالیا۔ کلورام کو مرتے [illegible] نے بیس ہزار کی پونجی سونپ دی تھی۔ کلورام بیوپاری قسم کی طبیعت رکھتا تھا..... ایک [illegible] جو ہر بات کو نفع ونقصان کی ترازو میں تولتی ہے۔ سکھی پر ۲۰ ہزار روپئے خرچ کرنا [illegible] نہیں تھی۔ اس لیے کلورام نے سکھی کے باپ کے سامنے وہ روپئے رکھ کے کہا۔

''آپ میرے پتا کے برابر ہیں۔ مجھے اپنا بیٹا مان لیجیے۔''

ان رسمی باتوں میں نقد اور جنس کا سودا طے ہوا۔ سکھی نے سوچا اب وہ بے زبان گائے نہ رہی۔ اب انسان کو انسان بن کر پیار دینا تھا۔ لیکن یہ جھوٹا خواب تھا۔ جس میں حقیقت کا نشان دور تک نہ تھا۔ وہ پھر کھو گئی۔ ایک انسان کے بیوپاری ذہن کی شکار ہو گئی۔ وہ اکثر سوچتی تھی۔

''کیوں یہ آدمی ایک عورت کو غلام سمجھتا ہے۔ ایک مچھلی کی طرح بے بس اور بے کس..... جو مرد کے ہر جال میں ایک مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی ہے۔''

یہی سوچتے ہوئے وہ شہر کی گلیوں میں مچھلیاں فروخت کرتی۔ کلورام نے بیس ہزار کے اس خریدے ہوئے غلام کی آمدنی میں آسانی سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سکھی عورت تھی...... پیار کی متلاشی..... زندگی کے خوشگوار جھونکوں سے ہمکنار ہونے کی امید رکھتی تھی، لیکن وہ اس کو نہ ملا۔ وہ ایسے سماج، ایسی رسموں اور ایسے مردوں کے چنگلوں سے آزاد ہو کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی تھی۔ اس میں بغاوت کا عنصر پل رہا تھا۔

ایک ایسا عنصر جس کو وقت یا تو سرد کر دے...... یا..... ایک جوالامکھی میں تبدیل کر دے۔ شہر کی ہر گلی میں سکھی کی آواز جانی پہچانی تھی۔ مچھلی جیسی خوبصورت اور سڈول جسم والی سکھی اکثر نوجوانوں کے لیے ایک مئے کا پیالہ تھی۔ لیکن اب تک اس صراحی دار گردن والی حسینہ کسی کی تشنگی کا شکار نہ ہو سکی تھی۔ موہن ساہو تو اس تاک میں بیٹھا تھا کہ چوری چھپے ایک بار صرف ایک بار اس مئے سے اپنی تشنگی مٹا دے۔

اس [illegible] نے آج سکھی سے کہا۔

"[illegible] تم [illegible] کیا چھ سیر مچھلیاں مل سکتی ہیں۔"

"[illegible] کب درکار ہے۔"

"[illegible] شام [illegible] بجے لانا۔"

"[illegible] لے گا بابو۔"

"صحیح بولو..... نہیں تو میں دوسرا انتظام کروں۔"

"نہیں بابو لاؤں گی۔ اور ٹائم پر لا دوں گی۔"

"اچھا"

موہن ساہو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں شراب کا نشہ چھایا جا رہا تھا۔ دوسرے دن سکھی نے مچھلیاں دن کے چار بجے برتن میں سنبھالتے ہوئے کلو رام سے کہا۔

"بہت دیر لگ جائے گی۔ ایک گاہک کو مچھلیاں دینی ہے۔"

"فکر مت کر۔ تو پیسہ لا۔ میں آج مچھلیاں پکڑنے دور سمندر میں جا رہا ہوں۔"

"لیکن کلو جلدی واپس آنا۔"

"تم بھی سکھی جلدی آنا۔"

کلو رام نے اپنا سامان سنبھال کے سمندر کا راستہ لیا۔ اس کا چھوٹا بوٹ بھی تھا۔ چھ سال سے اس نے اس بوٹ کا استعمال نہیں کیا تھا۔ مدھو نے کلو رام سے کہا۔

"کلو رام آج بہت مدت کے بعد پرانا راستہ کیوں یاد آیا۔"

"ہاں بھیا۔"

بوٹ میں چپو مارتے ہوئے وہ بہت دور سمندر میں چلا گیا۔ بہت دنوں بعد وہ یہ محنت کرنے نکلا تھا۔ لمبی رسی سمندر میں اتر گئی۔ وہ سوچنے لگا "کل سے اچھی خاصی آمدنی ہو گی۔ میں مچھلیاں پکڑوں گا۔ سکھی ان کو فروخت کرے گی۔" سکھی اس وقت موہن ساہو کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ "آؤ..... سکھی..... آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ میں تو کب سے

تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ سکھی اندر آ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ رات [illegible] تک کلورام ایک مچھلی بھی نہ پکڑ سکا۔ مدھو نے اپنی چھوٹی کشتی سے آواز دی۔

''کیا ہوا..... کلو..... کچھ ملا۔''

''نہیں بھائی..... آج قسمت میں شاید کچھ بھی نہیں لکھا۔''

''فکر کیوں کرتے ہو۔ ابھی بڑی مچھلی تمہاری رسی میں آ [illegible]''

''آ'' کلورام بڑبڑایا۔

''کیا ہوا بھائی۔''

''مدھو..... شاید..... بڑی مچھلی پھنس گئی ہے۔ تم ذرا میری کشتی میں آ جاؤ۔''

مدھو نے اپنی کشتی کو اس کی کشتی کے ساتھ کیا۔ پھر دونوں نے اس کو کھینچ لیا۔

کلورام چیخ پڑا۔

''سکھی۔''

سکھی سمندر میں مچھلی بن گئی تھی اور وہ بھی مردہ۔

# جب لوگ بولتے ہیں

جج صاحب اور دوسرے گھر کے رہنے والے اس دن کو نہیں بھول سکتے۔ جب جج کی بیوی ارچنا کو اس کے نوکر نے یہ اطلاع دی کہ سریتا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ ارچنا پریشان ہو اٹھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ سریتا کے کمرے میں اچانک اس کی نظر میز پر رکھی ہوئی پرچی پر پڑی۔ اس پر لکھا تھا۔

"مجھے جینے کا کوئی حق نہیں رہا۔ اس لیے مرنے کے سوا چارہ نہیں۔ میری خودکشی کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہوتی۔"

ارچنا کے اعصاب پر غش طاری ہوا۔ وہ چلانا چاہتی تھی۔ مگر چلا نہ سکی۔ اس کے تمام اعصاب بے حس و حرکت ہو گئے۔ اس کی زبان پر ایک لفظ آ کر رک گیا۔

"میری بیٹی۔"

جج صاحب نے جب بیوی کا یہ حال دیکھا تو گھبرا اٹھے۔ ان کے دوست نے مشورہ دیا۔

آپ کی بیٹی نے ایسا خطرناک قدم اٹھایا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس طرح ختم کرنے کے لیے ابھی تیار نہ ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ پولیس میں رپورٹ درج کی جائے۔ جس سے کہ اس کی تلاش کی جا سکے۔"

جج صاحب کو یقین نہ آیا کہ ان کا گہرا دوست یہ مشورہ دے رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بات پولیس کے ہاتھوں میں جانے کے بعد اور الجھ جائے گی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

''میں جانتا ہوں آپ کو میرا یہ مشورہ پسند نہیں۔ لیکن اس [illegible] بھی نہیں۔'' جج صاحب نے کچھ نہ کہا اور اپنی بیوی سے اکیلے میں مشورہ کرنے لگے۔ ان کی بیوی کی آنکھیں روتے روتے سوج گئیں تھیں۔

''لوگ کہتے ہیں کہ پولیس میں رپورٹ درج کرنی چاہیے''

''کیا؟''

تھوڑی دیر کے لیے سریتا کی ماں سریتا کا غم بھول گئی۔ اس پر دنیاوی خیالات غالب آ گئے۔

''نہیں.....نہیں.....آپ آج کل کی لڑکیوں کی انوکھی حرکتوں سے واقف نہیں ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ یہ سب راز ہی رہے۔'' لیکن جج صاحب اس سے بھی متفق نہیں تھے۔ ان کے مکان کے باہر چند آدمی جمع تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کشور تھا۔ کشور نے کہا۔

''یہ لڑکی جب چند دن پہلے میری بہن سے ملنے آئی تھی۔ کیا کہوں کتنی شوخ لڑکی تھی۔ میں یقین نہیں کرسکتا کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔'' پھر اس نے اپنے دوست سے کہا۔

''میں اس کے ساتھ محبت کرنے کا پلان بنا رہا تھا۔ لیکن اب بھگوان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے چند دنوں کی دیر کی۔ ورنہ ایک عدد محبوبہ کے غم میں آج میں سینہ پیٹتا ہوا نظر آتا۔''

بوڑھی عورتیں جو جج صاحب کے مکان میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے دوسری سے کہا۔

''میں کہتی ہوں یہ سب نئی تعلیم کا قصور ہے۔ مالتی یہ نئی تعلیم بری ہے۔ اس نے لڑکیوں کو خودسر اور باغی بنایا۔''

''ہاں سیتا مجھے اس لڑکی کے بارے میں دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔''

منشی اوم کار ناتھ، فیشن ایبل لڑکا، انوپ کمار، سی. آئی. ڈی انسپکٹر، نوجوان آدمی کشور، مالتی اور سیتا کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا کہ کب جج موتی لال پولیس میں رپورٹ درج کرائے اور پولیس کی تحقیقات سے یہ راز فاش ہو۔ لیکن جج موتی لال ششں و پنج میں پھنس گیا۔

ایک طرف خاندان کی عزت کا سوال اور دوسری طرف بیٹی کا۔ وہ اب تک فیصلہ نہ کرسکا کہ کس کا ساتھ دے۔ ان کے رشتے دار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیے۔ ... بار یہی کہہ رہا تھا۔ "اب یہ معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ جج صاحب کو ضرور پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیے۔" وکیل امرناتھ بھی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ پولیس میں رپورٹ کے بغیر معاملہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ان چند لوگوں نے اپنی اپنی رائے زنی سے پورے مکان کو سر پر اٹھالیا تھا۔ دو باتیں ہی ہو رہی تھیں۔

"پولیس.......رپورٹ۔"

لیکن سریندر کو یقین نہیں آیا کہ سریتا نے خودکشی کی ہوگی۔ کل ہی سریتا سے اس نے کہا تھا۔

"دیکھو سریتا یہ بالکل سچ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور اسی طرح کرتے رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہم کو نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ تم ایک امیر باپ کی بیٹی ہو اور میں ایک غریب باپ کا بیٹا۔ یہ امیری اور غریبی کا فرق ہمارے لیے دیوار بن سکتا ہے......" اس سے آگے وہ اپنے الفاظ ادا نہ کرسکا۔ سریتا نے ایک ادا سے بل کھا کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سریندر میرے پتاجی پرانے اور بوسیدہ خیالات سے بالاتر ہیں۔ میرے پاکیزہ خیالات کا وہ احترام کریں گے۔ مجھے ایک گائے کی طرح فروخت نہیں کریں گے۔ میرے فیصلے کو وہ کبھی رد نہیں کریں گے۔ تم کل ہی اپنے پتاجی کو میرے گھر بھیجنا۔"

سریندر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ "شاید سریتا نے اس کا ذکر اپنے پتاجی سے کیا ہوگا اور انہوں نے امیری کی دیوار کھڑی کی ہوگی۔ ایک دولت مند جج یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ اس کی پھول جیسی بیٹی ایک مفلس کے گھر میں جائے۔ سریتا نے اپنی بے پناہ محبت سے مجبور ہوکر یہ قدم اٹھایا ہوگا۔ اب مجھے بھی اپنی محبت کا ثبوت سریتا کی روح کو دینا چاہیے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ اب بھی شاید تڑپ رہی ہوگی۔ اب مجھے بھی اپنی پیاری سریتا سے

جلدی ملنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی روح مجھے بے وفا سمجھ بیٹھے۔

سریندر شور وغل کے ماحول سے تیز قدم بڑھاتا ہوا جج کے [illegible] کی [illegible]ف بڑھنے لگا تا کہ وہ بھی اس ویران دنیا کو چھوڑ کر وہاں جائے۔ جہاں سے اس کی [illegible] پکار رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے اضطرابی خیالات کو عملی جامہ پہناتا، اچا[illegible] ایک [illegible]یلی آواز ان گنے چنے لوگوں کے شور میں ابھری۔

"ڈیڈی...... یہ کیا ہنگامہ ہے۔"

سب سریتا کو دیکھ کر حیران تھے۔ جج صاحب آگے بڑھے اور سریتا سے پوچھا "تو کیا تم نے خودکشی نہیں کی......"

"کیوں ڈیڈی میں کیوں خودکشی کرتی۔"

جج کی بیوی ارچنا نے کہا "ارے بیٹی تم نے اپنے کمرے میں پرچی رکھی تھی۔ جس پر لکھا تھا کہ تم خودکشی کرنے جا رہی ہو۔"

سریتا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ...... ارے ماں وہ ہمارے کالج میں ڈرامہ ہے۔ اور میں بھی اس میں کام کر رہی ہوں۔ چونکہ وہ مجھے زبانی یاد کرنا تھا۔ اس لیے پرچی پر لکھا تھا۔"

سب یہ سن کر حیرت سے ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔

# زنجیر

یہ نہ سمجھئے کہ میں ایک ایسی زنجیر کا تذکرہ کرنے والا ہوں جس کے سہارے ہلیری کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ گئے یا جس کے سہارے پرانے زمانے میں انسان خوفناک دریا کو پار کرتا تھا۔ میں اس زنجیر کا ذکر کررہا ہوں جو عصا بن کے آپ کو راستہ نہیں دکھارہا ہو بلکہ لاٹھی بن کے آپ کی کمر توڑ کے رکھ دے۔ جناب یہ وہی زنجیر ہے۔ جس سے بڑی بڑی عمارتوں کو گرایا جاتا ہے اور اسی زنجیر کی مرزا غالب کو عمر بھر شکایت رہی۔ مرزا کو عمر بھر اس زنجیر سے نجات نہ ملی۔ زنجیروں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں دو اہم قسمیں ہیں۔ ایک ریشم کی زنجیر۔ نرم، سڈول، لچکدار اور ہاتھ میں نہ آنے والی۔ یہ زنجیر آپ کو اونچے اور بڑے مکانوں کے علاوہ سوسائٹی کی اہم پارٹیوں اور کلبوں میں تتلی بن کر ملے گی۔ دوسری زنجیر کھیتوں میں گھر کے چولہوں کے سامنے نظر آتی ہے۔ یہ زنجیر بڑی شکی ہوتی ہے اور مرد کے اشارے، حرکات وسکنات پر بڑی کڑی نظر رکھتی ہے۔ لیکن ریشمی زنجیر زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ شکی نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی مردوں کے لیے ریشمی پھندہ بن جاتی ہے۔ میں نے اپنے دوست کے سامنے ان مختلف قسم کی زنجیروں کا تجزیہ پیش کیا۔ تو اس نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"حضور میں ایسی زنجیر ڈلوانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔" مجھے بڑی ہنسی آئی۔ کیونکہ ایسے جواب میرے پیٹ میں ہنسی کے بل ڈالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ فطرت کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو میں یا تو اس کو یا خود کو دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف سمجھتا ہوں۔ لیکن میرا عزیز دوست دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ثابت نہ ہوا۔ چند دنوں کے بعد وہ صبح ہی صبح میرے گھر پر نازل ہوا۔

''حضور صبح صبح کیسے آئے؟''

ایک خوشخبری لایا ہوں۔''

''خوشخبری۔''

''جی ہاں خوشخبری..... میری..... میری شادی ہو رہی ہے...... شرمیلی آواز میں اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ میں نے لمبی اور گہری سانس لی۔ اس نے کہا

''آپ مجھے مبارک باد نہیں دیں گے۔''

''ہاں میں تو مبارک باد دینا ہی بھول گیا۔'' میں نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

''لیکن تم نے یہ نہیں پوچھا کہ مبارک باد کس آواز میں دوں۔ مترنم میں یا ماتمی میں۔''

''کیا؟'' اس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں پیارے اب تمہاری زندگی کی حرکتوں پر زنجیر پڑ جائے گی۔''

لیکن اس متوالے اور جوشیلے نوجوان پر میری نصیحتوں سے کیا اثر پڑتا؟ ایسے جوشیلے نوجوان کو ایک زنجیر کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر اس کے پاؤں میں زنجیر نہ پڑے تو ایک دیوانے ہاتھی کی طرح نہ جانے کتنوں کو زخمی کر بیٹھے۔ خیر میرے پیارے دوست کے جوشیلے جذبات پر زنجیر پڑ گئی۔ دو تین مہینوں تک وہ نظر نہیں آیا جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر مجھے ایک مئے خانے میں ملا۔ میرا تو میخانے سے قدیمی رشتہ تھا۔ لیکن اس نے یہ نیا رشتہ کیسے قائم کیا۔

''کیوں بھائی..... یہاں کیسے۔''

''یہاں کیسے۔'' اس نے شرابی آواز میں کہا۔ ''جیسے تم چلے آئے۔ ایک دن سب یہیں آئیں گے اور تمہاری اور میری طرح نشے میں جھوم کے نیا رنگ جمائیں گے۔''

''اے.... اے..... تم کیا سمجھو گے..... جب شادی کرو گے تب نا۔''

میں سمجھ گیا کہ زنجیر نے رنگ دکھایا۔ دوسرے دن وہ میرے پاس آیا اور ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں بہت دنوں سے آپ سے نہ ملا۔ شرمندہ ہوں۔ لیکن کل جس حالت میں آپ کو ملا۔ اس نے مجھے شرمندہ ہی نہ کیا بلکہ ندامت کے گہرے سمندر میں ڈبو دیا۔ یہ سب کیسے

ہوا۔ آپ پوری طرح واقف ہیں مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے رفیق اور شفیق دوست کے مشورے پر عمل نہ کر سکا اور اس لیے آج زندگی سمندر کے ایک بڑے بھنور میں پھنس کے رہ گئی ہے۔"

میں اس کو دیکھتا رہا۔ اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے کہا۔

"میرے دوست زندگی بذات خود ایک بھنور ہے اور جب بھنور ختم ہو جاتا ہے تو زندگی دم توڑ دیتی ہے۔ اس لیے اب میرا یہ مشورہ ہے کہ زندگی کو اس بھنور میں رہنے دو۔"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن آنکھوں سے ظاہر تھا کہ میرا مشورہ اس کو پسند نہیں آیا۔ ان دنوں وہ میرے پاس اکثر آیا کرتا تھا۔ پھر ایک ماہ تک نہ مل سکا۔ اور جب ملا تو اس کا پیلا چہرہ اس بار ہشاش بشاش نظر آیا۔ لگتا تھا کوئی خطرناک جنگ جیت کے آیا ہو۔ میں نے اس کی خوشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"اتنے دنوں کہاں رہے۔"

"حضور اتنے دنوں میں اپنی زنجیر کو توڑ رہا تھا۔ مجھے مبارک باد دیجیے کہ کامیاب ہوا۔"

میں خاموش رہا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں۔"

"اس لیے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم دوبارہ زنجیر نہ جوڑ لو۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "تب آسمان زمین پر گر پڑے گا۔ کائنات دم توڑ دے گی۔ آپ میرا یقین کیجیے۔"

کہنے کو تو میرے دوست نے بہت کچھ کہہ دیا۔ لیکن کہنے اور عمل کرنے میں اتنا ہی فرق ہے۔ جتنا بندے اور خدا کے درمیان۔ چھ ماہ تک وہ مجھے ملتا رہا اور ہر دن اس زنجیر کے بارے میں اپنی ناراضگی کا رونا روتا رہا۔ پھر اچانک غائب ہوا۔ دو ماہ بعد ایک گلی کے موڑ پر ملا۔ وہ نظر بچا کے میری نظروں سے اوجھل ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''نقیب صاحب آپ۔''

''جی ہاں میں ہوں۔''

''جی میں شرمندہ ہوں۔ اتنے دنوں آپ کو نہ مل سکا۔''

''اس سے زیادہ تم اس بات پر شرمندہ ہو کہ تم پھر اپنے [illegible] قائم نہ رہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اپنے پاؤں میں نئی زنجیر کب ڈالی۔''

''جی ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔''

تو سچ مچ میرا دوست اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔ لیکن میں اس کو گناہ گار نہیں سمجھوں گا۔ میں جو زنجیر کے خلاف لمبی چوڑی باتیں کیا کرتا تھا۔ ایک دن وہی زنجیر میرے پاؤں میں بھی پڑ گئی۔ میرے دوست نے کہا۔

''کیوں صاحب یہ کیا ہوا۔''

''وہی ہوا صاحب جو تمہارے ساتھ ہوا۔''

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آدمی اس زنجیر کے بغیر نباہ بھی نہیں کر سکتا۔

# خدا کون ہے؟

جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ ہوتو ہاتھ بار بار جیب میں چلا جاتا ہے۔ آدمی کی نفسیات بھی کیا چیز ہے! جب جیب میں پیسہ نہ ہوتو محسوس ہوتا ہے کہ جسم کا کوئی حصہ غائب ہے۔ میری جیب میں بھی بار بار ہاتھ چلا جاتا ہے اور بار بار یہی محسوس کرتا ہوں کہ میرے جسم کا کوئی حصہ غائب ہو گیا ہے اور ایسے میں لبوں پر ایک دکھی سیٹی آ جاتی ہے۔ اس دن بھی سیٹی بجاتے ہوئے اپنی دھن میں گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک چمکیلے نوٹ پر پڑی۔ میں اداس سیٹی کے ترنم کو بھول گیا۔

''ہزار روپئے کا نوٹ۔''

نوٹ کو اٹھانے سے پہلے میں نے اردگرد نظر ڈالی۔ سوچا کہ کہیں کوئی آدمی نہ نکل آئے اور یہ کہے۔

''یہ تو میرا ہے۔ میں نے لطف لینے کے لیے سڑک پر رکھ دیا تھا۔''

لیکن محلے کا یہ کوچہ سنسان تھا۔ میں نے جھک کر ہزار کا نوٹ اٹھایا۔ مجھے اب تک یقین نہیں تھا کہ وہ اصلی نوٹ تھا۔ میں نے خود سے کہا۔

''آج خدا بہت جلد میری حالت سے واقف ہوا۔'' میں اب خیالات کی گرفت سے آزاد ہو کر عملی زندگی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہزار کے نوٹ کی بہت قیمت ہے پھر ایسے آدمی کے لیے جس کی تنخواہ ۵ ہزار اور بہت بڑا کنبہ ہو۔ اس لیے ہزار روپئے کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذہن میں پروگرام تشکیل دینے لگا اور سوچتے ہوئے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ دماغ کے کسی گوشے سے آواز آئی۔

''یہ ہزار کا نوٹ ہے نا۔''

''ہاں۔ کسی کا بھی ہو لیکن اب میرا ہے۔''

''تیرا۔'' میرا ذہن میرے اس جواب سے مطمئن نہیں تھا [illegible] ا ہے۔ یہ اس کا ہے جس کا تھا۔''

''نہیں اب یہ میرا ہے۔''

''نہیں یہ اس کا ہے جس کا تھا۔'' میرا ذہن چیخ پڑا۔ ''صرف ایک ہزار روپیہ پا کے سب کچھ بھول گئے۔ بھول گئے کہ اگر یہ ہزار روپیہ کسی بچے نے کھو دیا ہوگا تو اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ جانتے ہو کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟''

''وہ خوف کے مارے گھر نہیں جائے گا۔ وہ بھاگ جائے گا اور نہ جانے کن کن مصیبتوں کا سامنا کرے گا۔''

''نہیں'' میں چیخ پڑا۔

میرے سامنے بچپن کا وہ زمانہ آگیا۔ جب میں نے سو روپے کا نوٹ کھو دیا تھا۔ جس کے لیے گھر والوں نے مجھ پر طرح طرح کی اذیتیں ڈھائیں اور یہ ایک ہزار کا نوٹ جو مجھ میں لالچ بھر گیا تھا۔ اب وہ کافور ہو گیا۔ میں نے خود سے کہا۔

''مجھے اس بچے کو ڈھونڈنا چاہیے جس نے ہزار روپیہ کھو دیا۔''

میں اسی گلی کی طرف روانہ ہوا۔ سوچا شاید وہ بچہ روپیہ ڈھونڈ رہا ہوگا۔ گلی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن یہ نوٹ میرا سکون منتشر کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''نہ جانے کہاں گیا وہ بچہ۔''

میں گم سم کھڑا ہر طرف اپنی نظر دوڑا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر طرف دھواں پھیل رہا ہے۔ لالچ کا دھواں۔ اور میں اس دھوئیں میں قید ہو گیا۔ اچانک اس دھوئیں میں ایک روشنی کی کرن آئی۔ وہ کرن تھی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی۔ جو زمین پر بڑے غور سے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اچھی خاصی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کو دیکھ کر

میرے دماغ میں پھر ایک نیا خیال کوند گیا۔

"اگر اس آدمی کو ہزار روپیہ مل جائے تو کیا ہوگا۔ یہ تو اچھی خاصی پوزیشن والا لگتا ہے۔ پیسہ آتے ہی میں اس ہزار روپیہ کو خرچ کرنے کے لیے پھر پروگرام تشکیل دینے لگا۔ میں نے خود سے کہا۔

"ابھی مہینے کے دس دن باقی ہیں۔ سگریٹ پر ۱۰۰ روپئے خرچ ہوں گے۔ منی کے لیے ۲۰۰ روپئے میں جوتا آئے گا۔ بجلی بل بھی ادا نہیں ہے۔ اس کے ۴۰۰ روپئے ادا کر کے بجلی کی روشنی میں اخبار پڑھنا نصیب ہوگا۔ پھر بھی ۳۰۰ روپئے بچ جاتے ہیں..... بہت دنوں کے بعد میں اپنے دوست امتیاز کے ساتھ انگریزی وسکی پی لوں گا۔

اب میں گھر کی طرف جانے کو تیار ہوا۔

لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا یہ آدمی ہزار روپیہ ڈھونڈ رہا ہے یا کچھ اور۔

"آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"میں" اس آدمی نے کھوئے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"بھائی صاحب تھوڑی دیر پہلے میں یہاں پیشاب کرنے بیٹھا اور میری جیب سے ہزار روپئے کا نوٹ گر گیا۔"

میں نے طنزیہ آواز میں کہا۔

"لیکن بھائی اب وہ نوٹ آپ کو کہاں ملے گا۔"

"ہاں یہ تو صحیح ہے۔" اس نے دکھی آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اسے ملنا چاہیے۔"

"کیا مطلب؟"

اس آدمی نے سنجیدہ آواز میں جواب دیا۔

"بھائی صاحب میں غریب آدمی ہوں۔ حاجت پڑ گئی۔ ایک آدمی سے ہزار روپیہ ادھار لیا۔ جب میں اس سے کہوں گا کہ روپیہ کھو گیا تو وہ یقین نہیں کرے گا۔ اس کو میری نیت پر شک ہوگا۔"

میں بت بن کر اس آدمی کی باتیں سن رہا تھا۔

''بھائی صاحب میری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اور مجھے [illegible] رو[illegible] سے کچھ چیزیں لانی تھیں۔''

اف..... میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ہزار روپیہ ایک بیٹی کی [illegible] پر [illegible] کرنا بہتر یا وسکی اور سگریٹ پر۔ میرا دل چیخ پڑا۔

''نہیں.....''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اس آدمی سے کہا۔

''یہ تو نہیں ہے آپ کا ہزار روپیہ۔''

''یہ ہزار روپئے کا نوٹ تو ضرور ہے۔''

میں نے کہا۔

''جی ہاں یہ ہزار کا نوٹ ہے اور آپ ہی کا ہے۔ لیجیے اپنا نوٹ۔''

اس آدمی نے ہزار روپیہ کا نوٹ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لے کر کہا۔

''آپ تو اس وقت میرے لیے خدا بن گئے۔''

خدا کون ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔

# پتھر کا زخم

خیالوں کے لیے ایک عمر ہوتی ہے اور وہ بھی خاص۔ اور خیال بھی خاص ہوتے ہیں۔ رینو کے پاس بھی خیالات تھے۔ خیالات جو عمر کے مطابق آتے ہیں اور جاتے ہیں رینو نے عمر شباب کو چھو لیا۔ عمر شباب جو بہت ساری باتیں اپنے ساتھ لاتی ہے۔ تو بہت ساری پیچیدگیاں بھی۔ رینو جو بچپن سے اب تک تھی وہی رہنا چاہتی تھی۔ عجیب لڑکی تھی...... عجیب خیالات تھے اس کے۔ عمر تو اس سے اور کچھ تقاضا کر رہی تھی۔ اس کی سہیلی نینا نے کہا۔

''عمر آئی ہے جب کچھ ہونے والا ہے۔''

''ہر گز نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا۔''

نینا ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔

''وہ عمر چلی گئی جب بچوں جیسی باتیں کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ زندگی کے اصولوں پر عمل کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔''

لیکن رینو اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔

''میرے پتھر جیسے مجسمہ پر کوئی زخم نہیں لگائے گا۔''

نینا پھر ہنس پڑی۔ وہ جانتی تھی کہ رینو کے فیصلہ میں حقیقت کا کوئی عکس نہیں۔ رینو کیا سوچتی تھی اور سوچ کر کہاں کھو جاتی تھی۔ نینا کے لیے ایک معمہ تھا۔ زخم اس کے ذہن کے لیے الجھن بن گیا۔ ایسی الجھن جو اس کے ذہن کو بے حس بنا دیتا تھا۔ جس نے اس کی جوانی کی حرارت سرد کر دی تھی۔ اس کا ذہن کہتا۔

''کاش میں عورت نہ ہو کر مرد ہوتی۔ تب نہ جانے کیا ہوتا؟''

ایسا احساس انسانی ذہن کو پاگل کر دیتا ہے اور پاگل ذہن ... بھی ... سکتا ہے۔ جوانی کا طوفان اور بھی طوفان اپنے ساتھ لاتا ہے۔ حالانکہ رینو کی جوانی ... حرارت نہ تھی۔ جہاں حرارت نہیں ہوتی وہاں ایسی سردی رہتی ہے جو جم کر برف بنا دیتی ... شخصیت کڑوی ہوتی ہے یا کڑواپن اس کی فطرت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

رینو کی ماں نے رینو سے کہا۔

''وہ آرہے ہیں۔''

''کون؟''

ماں نے اس کے گال پر چپت مارتے ہوئے کہا۔

''تجھے آج لڑکے والے دیکھنے آرہے ہیں۔''

رینو چیخ پڑی۔

''ماں ان کو کہہ دو کہ نہ آئیں اور کوئی گھر تلاش کریں۔''

ماں بت بن گئی۔ وہ حیرت سے اپنی بیٹی کو تک رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''کیوں بیٹی کوئی اور لڑکا تیری نظر میں ہے؟''

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو عمر بھر اپنی ماں کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔''

ماں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن بیٹی لڑکی کو ایک دن پرائے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ یہ دنیا کا اصول ہے۔''

''ضد مت کرو بیٹی۔''

رینو نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

''لیکن ماں یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

معاملہ کی نزاکت کہہ رہی تھی کہ بیٹی کے ساتھ اس وقت سمجھوتہ کرے۔

''اچھا تو جو چاہتی ہے وہی ہوگا لیکن اس وقت ہم لوگوں نے ان کو یہاں بلایا ہے۔

مہمانوں کی ہر حال میں عزت کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے تم ان کے سامنے چائے کی ٹرے لے کر جانا۔ پھر میں ان لوگوں سے کہوں گی کہ ہمیں ان کا لڑکا پسند نہیں آیا۔"

رینو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن یہ اٹل فیصلہ ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔"

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ وقت کی رو اس کی بیٹی کے خیالات پاش پاش کر دے گی۔ مہمان آ گئے تھے۔ رینو وعدے کے مطابق چائے کی ٹرے لے کر آ گئی۔ سدیش کی ماں نے رینو کو اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"بہت ہی خوبصورت ہو تم بیٹی۔ بھگوان تمہیں دنیا کے سارے سکھ دے۔"

بوڑھی عورت کی باتیں رینو کے جسم کی نس نس میں چنگاریاں بھر رہی تھیں۔ لیکن وہ خود پر قابو کیے تھی۔ شکر یہ تھا کہ لڑکا نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید رینو قابو میں نہ رہتی۔ رینو کے جانے کے بعد اس کی ماں نے سدیش کی ماں سے کہا۔

"آپ نے کہا تھا کہ لڑکا بھی آ رہا ہے۔"

"بہن کیا بتاؤں۔ لڑکا کہتا ہے زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔" نہ جانے آج کل کے ان لڑکوں پر کیسا بھوت سوار ہوا ہے۔

"بہن یہ بھوت نہ صرف لڑکوں پر بلکہ لڑکیاں بھی اس کی شکار ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میری لڑکی نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں کہی ہیں۔ کیوں نا ہم لڑکی اور لڑکے کو ملا دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر شادی کے لیے راضی ہو جائیں گے۔"

"ہاں بہن..... یہ ٹھیک رہے گا۔"

دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا۔ دوسرے دن نینا نے کہا۔

"بات چل پڑی۔"

"بات! کیا بات چل پڑی؟"

"نہیں میری شادی نہیں ہوگی۔"

''آ..... ہا.....بھولی کیا بن رہی ہو۔ تمہارے پتا جی شادی کی تیاری میں لگے ہیں اور تم شادی کے لیے راضی نہیں۔''

رینو نے غصہ میں کہا۔

''میں پوچھوں گی ممی سے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

''بی بی ہم احمد پارک میں ہوا خوری کے لیے آئے ہیں کسی لڑائی کی ریہرسل کے لیے نہیں۔''

نینا نے ایک بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی یہاں ہے۔''

''کون؟''

''وہی جس کے ساتھ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔''

''کیا بک رہی ہو؟''

''جی ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ سامنے بیٹھا ہوا ہے۔''

''اچھا! میں ابھی اس کا حساب چکتا کرتی ہوں۔''

نینا ہنس پڑی۔ رینو نے زمین پر لات ماری اور لڑکے کی جانب بڑھی۔

''اے مسٹر۔''

لڑکے نے اپنا سر کتاب سے اٹھایا۔

''جی آپ نے مجھ سے کہا۔''

''آ..... ہا..... باتیں ایسے کرتے ہو جیسے مجھے جانتے ہی نہیں۔ لیکن مسٹر یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔ میں کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

رینو نے یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔ اب لڑکے نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

''رینو دیوی میں بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ میں شادی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن میں کسی کو یہ بتا نہیں سکتا۔''

رینو چیخ پڑی۔ اس کا دماغ چکرایا۔ اس کو کچھ یاد آیا۔ ہاں یاد آیا جو وہ بھول گئی تھی یا وہ
جو [illegible] تھی یا جس پر وہ پردہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے دھیمی آواز میں کہا۔
''اور اگر میں بھی شادی کرنے کے قابل نہ ہوؤں تو اس حالت میں ہم دونوں کا
[illegible]سار رہے گا۔''

سدیش حیران نظروں سے رینو کو تکنے لگا۔ اس شام رینو نے ماں سے کہا۔
''میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

# موتی اور کرن

موتی کیچڑ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ پیدا بھی ہوا تھا اسی کیچڑ میں۔ اس کے والدین، اس کے رشتہ دار اور اس کے آس پاس والے اسی کیچڑ میں اس کے ساتھ رہ رہے تھے۔ وہ اکثر خود سے کہتا۔

''بھلا میں موتی کہاں ہوں۔ میں تو کیچڑ میں پڑا ہوں۔''

لیکن اس کو کیا معلوم تھا؟...... کہ...... موتی اکثر کیچڑ میں ہی پڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کو دیکھنے کے لیے ایک جوہر شناس آنکھ ہونی چاہیے۔

اور کرن کیچڑ میں نہیں بلکہ آسمان پر ہوتی ہے۔ کرن تو آسمان سے زمین پر چلی آتی ہے۔ لیکن وہ تو سورج کی کرن ہے اور یہ کرن تو آسمان کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی..... عالیشان مکان میں رہتی ہے۔

وہ آسمان پر...... اور موتی..... موتی زمین پر...... بھلا ان میں کیا مناسبت ہے۔ لیکن موتی کے خیالات کو...... جذبات کو...... کون روک سکتا ہے۔ پھر اس کے پاس ایک انسانی دماغ ہے وہ دماغ تو موتی کا دماغ تھا۔ جو ہر بات کا تجزیہ کرتا اور ہر تجزیے میں نئی بات پاتا۔ غریب کے پاس دنیاوی سکھ نہیں ہوتا۔ اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ اس کے جذبات ہوتے ہیں۔ موتی نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں پیدائش ہی سے کمانے کا سبق دیا جاتا ہے۔ موتی نے ماحول سے بغاوت کی۔ ماحول کے اصولوں سے..... ان قدروں سے۔ ان تقاضوں سے۔ لیکن وہ بغاوت کب تک ساتھ دیتی۔ میٹرک کے بعد تقاضوں کا یہ سلسلہ اس قدر بڑھ گیا کہ اس نے خود کو تقاضوں کے حوالے کر دیا۔ پھر جدوجہد کی ایک لمبی دوڑ شروع ہو گئی۔

ایسی ... آدمی گر بھی جاتے ہیں ... زخمی بھی ہوتے ہیں۔ پھر بھی جد و جہد کی دوڑ ختم نہیں

ہوتی۔ ... دوڑتی۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر...... دوسرے سے تیسرے...... آخر ایک دفتر
کے ... نے کہا۔

''سات ہزار کی کلرکی ملے گی..... کرو گے۔''

''نہ کرنے کا سوال ہی نہیں...... میں تو کام کرنے کے لیے آیا ہی ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ کل سے کام پر آ جاؤ۔''

وہ دوسرے دن سے کام پر آیا۔ پھر ہر دن کام پر آتا رہا۔ تقاضے ٹھنڈے پڑے یا یوں کہیے کہ تقاضوں نے راستہ بدل لیا۔ صرف ۷ ہزار سے ان تقاضوں نے راستہ بدل لیا۔ لیکن احساسات مر نہیں جاتے۔ جذبات ٹھنڈے نہیں ہو جاتے۔ وہ شعور اور لاشعور کے خلا میں اٹک کے رہ جاتے ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔ دماغ کی وسعتیں سکون ڈھونڈنے کے لیے سرگرداں رہتی ہیں۔ وہ الجھنوں میں پڑا ہوا تھا۔ اور ان سے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک سریلی آواز نے موتی کو فرار کا راستہ دکھایا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مسٹر..... آپ کو معلوم ہے..... مسٹر ورما..... ایڈوکیٹ کا گھر کہاں ہے؟''

موتی نے اس جوان لڑکی کو غور سے دیکھا۔ جس کے پاس قدرتی حسن کے علاوہ ایک قیمتی ساڑی بھی تھی۔ ایک قیمتی ساڑی کی تعریف میں نہ جانے کیوں موتی ایک قصیدہ پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کو یاد آیا کہ لڑکی نے کوئی سوال پوچھا تھا۔

''آیئے میں دکھاتا ہوں آپ کو مسٹر ورما کا گھر۔ وہ حال ہی میں یہاں رہنے آئے ہیں۔''

وہ خاموشی سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلنے لگے۔ موتی خاموشی پسند نہیں کرتا تھا۔ یا تو دماغی خیالات کا بہاؤ..... ایک لڑکی کے ہوتے ہوئے دماغ پر کب اختیار رہتا ہے اور پھر خاموشی۔ خاموشی موت کو کہتے ہیں۔ موت کو۔ اس لیے موتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کسی کے خلاف کیس دائر کرنا ہے۔''

''نہیں تو۔'' لڑکی بھی ہنس پڑی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مسٹر ورما ایڈوکیٹ تو

میرے چاچا ہیں۔"

"بڑے آدمی کی بیٹی ہو۔" موتی نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہاں ہوں؟..... میں تو ایک چھوٹے آدمی کی بیٹی ہوں۔"

"آپ کے پتاجی کیا کرتے ہیں؟"

"لو اب تم حسب ونسب پوچھنے لگے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے پتاجی دس ہزار روپئے کی کلرکی کرتے ہیں۔"

"کلرک ہیں وہ۔ لیکن آپ کی یہ قیمتی ساڑی تو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کی داستان سنا رہی ہے۔"

"آخر تم بھی دھوکا کھا گئے نا۔ یہ تو میرے چچا نے جنم دن پر تحفے میں دی۔"

موتی زور سے ہنس پڑا۔

"مجھے ایک کہانی یاد آئی۔ سنو بڑی دلچسپ کہانی ہے۔"

"تم کہانیاں بھی لکھتے ہو۔"

"ہاں۔" موتی سنجیدہ ہوا۔ "ہاں جب دماغ پر قابو نہیں رہتا، جذبات بہے جاتے ہیں۔ احساسات ایک طوفان کی طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔"

"جو کہانی احساسات، جذبات اور انسانیت کی ترجمانی کر رہی ہو۔ وہ اچھی ہونی چاہیے۔ مجھے فنکاروں سے عقیدت ہی نہیں محبت بھی ہے۔ ذرا سناؤ تم اپنی کہانی۔"

"ایسی کہانیاں صرف شروع ہوتی ہیں۔ اختتام چھو بھی نہیں پاتی۔" ورما کا گھر آ گیا۔ لڑکی نے کہا۔

"تمہاری کہانی بہت اچھی ہے۔ لیکن میں پوری نہ سن پائی۔ کسی رسالے میں کیوں نہیں چھپواتے۔ ماہنامہ 'بندھن' کو بھیج دو۔"

"کیا چھاپ دیں گے؟"

"کیوں نہیں؟....... اچھی اور معیاری کہانیاں وہ چھاپتے ہیں۔"

"اچھا.... آپ نے کہا ہے تو روانہ کر دوں گا۔ لیکن نہ آپ نے اپنا نام بتایا۔ نہ میں

نے ہن[illegible] اپنا [illegible]را نام موتی کشن ہے۔ بجلی محکمے میں کلرک ہوں۔"

"[illegible]را نام کرن ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "میں بی۔اے میں پڑھ رہی ہوں۔ اب مجھے اجاز[illegible]یے۔"

کرن ورما کے مکان میں داخل ہوئی۔ موتی نے کرن کو جاتے ہوئے دیکھا۔ کرن نے کہا تھا۔

"تمہاری کہانی اچھی ہے۔"

موتی نے سوچا۔

"کرن نے کہا.... وہ روشنی تھی۔ مجھے ماہنامہ 'بندھن' کے ایڈیٹر کے پاس خود جانا چاہیے۔"

تھوڑی سی ہمت افزائی آدمی کو بہت دور تک لے جاتی ہے۔ لیکن موتی دور تک نہیں گیا۔ وہ صرف ماہنامہ 'بندھن' کے دفتر تک گیا۔ اتفاق سے موتی کو ماہنامہ کا سب ایڈیٹر ملا۔ سلام کر کے موتی نے کہا۔ "جناب ایک کہانی لایا ہوں۔"

"کہانیاں تو بہت آتی ہیں۔ لیکن معیاری بہت کم ہوتی ہیں۔" سب ایڈیٹر نے کہا۔

"پھر بھی تم اپنی کہانی پڑھ کر سنا دو۔"

موتی نے زندگی کے بنے ہوئے ایک جال میں پھنسے ہوئے آدمی کی روداد پیش کی۔ وہ کہانی نہیں تھی۔ حقیقت تھی۔ نہیں یوں کہیے کہانی ہو کر بھی گمان یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک حقیقت تھی۔ کہانی ختم ہوئی لیکن اب تک کہانی کا تاثر ماحول میں رچا ہوا تھا۔ ایک ایسا تاثر جس نے سب کو خاموش کر دیا۔ سب ایڈیٹر نے کہا۔

"تمہاری کہانی واقعی ایک متاثر کن کہانی ہے۔"

"شکریہ۔"

"تم کہانی کو یہاں چھوڑ دو۔ چھپ جائے گی۔"

"بہت......بہت..... شکریہ۔"

اس وقت موتی نے اپنے آپ کو دنیا کا خوش ترین آدمی تصور کیا۔

اسی خوشی میں مگن وہ سب ایڈیٹر کے دفتر سے نکلا اور کسی سے ٹکرایا۔ وہ کرن تھی۔ موتی نے کہا۔

''اوہ معاف کیجیے۔''

''ارے تم تو وہی ہو......نا......جو......مجھے...... ہاں...... [illegible] ......صاحب کا مکان تم ہی نے مجھے دکھایا......اچھا اب یاد آیا۔ تم اپنی کہانی لے کر آ۔ [illegible]''

''جی ہاں۔ اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ وہ عنقریب ہی شائع ہو رہی ہے۔''

''واقعی خوش قسمت ہو۔ پہلی بار میں ہی تمہاری کہانی منظور ہوگئی۔''

''یہ سب تو آپ کی وجہ سے ہوا۔'' موتی نے ممنون ہوتے ہوئے کہا۔

''میری......وجہ......وہ کیسے۔'' کرن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ نہ کہتیں کہ کہانی اچھی ہے۔ تو میں نہ آتا ماہنامہ 'بندھن' کے دفتر۔''

''اوہ''

''کرن دیوی میں اس خوشی میں آپ کو چائے پلانا چاہتا ہوں۔''

''چائے'' کرن نے کہا۔

''ہاں.....انکار نہ کیجیے۔''

موتی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ انکار نہ کرسکی۔ یہ سلسلہ چائے پر ختم نہ ہوا۔ چائے اس سلسلے کی ابتدا تھی۔ نہ جانے وہ دونوں کہاں تک چلے۔ کتنی دور تک چلے۔ ایک نئی امنگ لیے اور نیا سوز اور موسیقی کا عجیب وغریب ترنم لیے بڑھتے ہی گئے۔ ایک دن موتی نے کرن سے کہا۔

''کرن سوچتا ہوں میں نے تمہیں پا کے کچھ کھو دیا۔''

''ہاں کھویا۔''

''کیا؟''

''تم کہانیاں نہیں لکھتے۔''

''اوہ.....کرن......تم نے واقعی مجھے یاد دلایا۔ ہاں میں بھول گیا تھا۔''

...پ نہ بھولنا۔"

...ری صبح اس نے نئے موضوع پر قلم اٹھایا ہی تھا کہ ڈاکیہ نے دستک دی۔ اس نے خط ک... یہ تو اس کی پہلی کہانی تھی۔ لکھا تھا۔

محترمی!

ہم آپ کی کہانی شائع کرنے سے معذور ہیں۔

سب ایڈیٹر

بی۔ایل بھوشن

موتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے قلم توڑ دیا۔ نئے موضوع پر لکھے ہوئے چند اوراق پھاڑ ڈالے۔ وہ چیخ اٹھا۔ "سب ایڈیٹر تو نے اس دن کہا تھا۔ کہانی چھپ جائے گی۔ جھوٹ کیوں کہا۔"

ادب میں بھی ایک عجیب فطرت کام کرتی ہے۔ موتی ایک حساس دل رکھتا تھا۔ درد سے آشنا اور غم سے بھرا ہوا دل۔ اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ کرن نے جب اس کو دیکھا تو بولی۔

"آج کیا ہوا تمہیں۔"

"کرن میں نے کہانیاں لکھنی چھوڑ دی۔"

"کیا کہتے ہو۔ ایسا کیوں۔"

"ماہنامہ 'بندھن' کے سب ایڈیٹر نے میری وہ پہلی کہانی واپس کردی۔" موتی نے ٹوٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اف.....تم اسی لیے ہمت ہار گئے۔ لاؤ وہ کہانی کہاں ہے۔"

"تم کیا کرو گی، اس کہانی کا۔"

"وہ ماہنامہ 'بندھن' میں چھپ جائے گی۔ 'بندھن' کے ایڈیٹر میرے ڈیڈی کے گہرے دوست ہیں۔"

واقعی موتی کی کہانی 'بندھن' میں چھپ گئی۔ کرن کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے موتی نے کہا۔

''تم نے واقعی کمال کر دیا۔''

''میں نے کمال نہیں کیا۔ یہ تو تمہاری کہانی ہے۔ جس نے [illegible]

موتی کے نام پرستاروں کے خطوط آنے لگے۔ بے شمار خطوط [illegible] نے اس کے جذبۂ شوق کو ایک نئی قوت عطا کی۔ وہ کہانیاں لکھتا رہا اور کرن کے [illegible] ا۔ ایک دن اس نے کہا۔

''کرن آج میں جو کچھ ہوں تمہاری وجہ سے ہوں۔ موتی جو [illegible] میں پڑا ہوا تھا۔ آج لاکھوں دلوں کا ترجمان ہے۔''

''لیکن تم یہ بھول رہے ہو کہ یہ تمہاری کہانیاں ہیں جس نے تمہیں اس قدر مقبول بنا دیا۔''

تھوڑے ہی عرصے میں موتی صف اول کے ادیبوں میں شمار ہونے لگا۔ آج وہ اپنی بہترین تخلیق خود 'بندھن' کے ایڈیٹر کو دینا چاہتا تھا۔ 'بندھن' کے قدآور دفتر کو دیکھ کر وہ اندر داخل ہوا۔ چپراسی سے پوچھا۔

''ایڈیٹر صاحب ہیں۔''

''ہاں ہیں۔''

''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''جائیے مل آئیے۔''

وہ ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایڈیٹر صاحب کھڑکی کے پاس کھڑے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔

''ایڈیٹر صاحب۔''

وہ پیچھے مڑ گئی۔

''کرن۔''

ہاں موتی میں ہی 'بندھن' کی ایڈیٹر ہوں۔ میرے ڈیڈی ایک سال پہلے فوت ہوئے اور پھر مجھے ایڈیٹری کی کرسی سونپ دی گئی۔''

موتی [illegible] سوچ رہا تھا۔ کرن نے کہا

"تم کیا سوچ رہے ہو۔"

"کرن" موتی نے سنجیدہ آواز میں کہا۔ "میں سوچتا ہوں کہ موتی کو اگر کرن نہ ملتی تو وہ بھی دوسرے ہزاروں موتیوں کی طرح کیچڑ میں دم توڑ دیتا۔"

# سڑک جارہی ہے

موسیٰ محلے میں پہلی بار پختہ تارکول کی سڑک جارہی ہے۔ بل کھاتی ہوئی اس سڑک کے کنارے ایک مکان کھڑا ہے۔ ایک ایسا مکان جو خود بھی ایک تمثیل بن کے رہ گیا ہے۔ اب تو اس مکان نے اپنے ساتھ ایک مخصوص نام بھی لپیٹ لیا ہے۔

خونی بنگلہ!

شاید اب گاؤں میں یہ واحد مکان تھا۔ جو نہ صرف پختہ اینٹوں سے بنایا گیا بلکہ ایک تاریخ بھی اپنے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ تاریخ بنانے والے صرف نسان ہی نہیں ہوتے۔ چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ مکان خونی بنگلے کے نام سے مشہور ہوا۔ ہزاروں داستانیں اس مکان کے ساتھ وابستہ ہوگئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان داستانوں میں کچھ ہی حقیقت پر مبنی تھیں۔ مغل بادشاہوں کے ایک نوکر خاص نے اپنے لطف و آرام کے لیے یہ مکان بنوایا۔ ناچ اور رنگ کی محفل سے یہ مکان سارے گاؤں کا چاند بن گیا تھا۔ مگر مغلوں کے زوال کے بعد نوکر خاص کا قتل ہوا۔ انگریزوں کے ہاتھ اقتدار آیا۔ پھر ایک صاحب بہادر اس مکان میں رہنے لگے۔ صاحب بہادر کی گوری گوری میمیں اس مکان کی زینت بن گئیں۔ اصلی انگریزی شراب بہنے لگی اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس مکان میں نئے حالات پیدا ہوئے۔ پھر ایک رات ہاں ایک ایسی رات جب ہر طرف گھنگور گھٹاؤں کے آنچل میں چاند بھی چھپ گیا۔ ایک گوری میم کے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس مکان میں پائے گئے۔ صاحب بہادر بھاگ گئے۔ ان کے نوکر کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ تب سے اس مکان کا نام خونی بنگلہ پڑا۔

انگریزوں کے چند چمچے ہوا کرتے تھے۔ ان چمچوں کو اس زمانے میں جاگیردار کہا

جاتا تھا۔ ایک ... جاگیردار کے حصے میں موسیٰ محلہ اور شاداب گاؤں بھی آ گیا۔ ساتھ ہی بنگلہ بھی مگر ... جاگیردار صاحب اس بنگلے میں داخل ہوئے۔ انگریز حکومت نے دم توڑ دیا۔ جاگیرداری نہ رہی صرف نام کا لیبل چہرے پر چسپاں رہا۔ اس لیبل کو برقرار رکھنے کے لیے خونی بنگلہ کو اونے پونے داموں میں فروخت کرنے کی مجبوری آ گئی۔ شہر کا باشندہ جس کا نام بانکے لال تھا، نے اسے خرید لیا۔ ان ہی دنوں موسیٰ محلے میں پختہ تارکول کی سڑک بنائی جا رہی تھی۔

بانکے لال کے بارے میں گاؤں والے کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ بانکے لال اور اس کی بیوی اس خونی بنگلے کی طرح کچھ معمہ سے تھے۔ ایک زمانے میں بانکے لال کے پاس کافی دولت تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ تب بانکے لال نے پیسوں کا مال روپیوں میں فروخت کیا۔ پیسے جب روپیوں کے حساب سے آنے شروع ہوتے ہیں تو آدمی کی لاپرواہی انتہا کو چھو جاتی ہے۔ اس انتہا نے بانکے لال کو شراب کا دوست اور عورت کا پرستار بنا دیا۔ لیکن برا ہو نرم دل کا جو موم کی طرح پگھل پگھل کر چاند بائی کی پازیب بن گیا۔ چاند بائی بہت عرصہ تک بانکے لال کے دل کو پازیب بنا کے مطمئن تھی۔ مگر ایک دن جب چاند بائی کو اپنے ڈھلتے ہوئے حسن کا خیال آیا۔ خوابوں کے محل مسمار ہو گئے۔ بانکے لال اپنی انوکھی شرافت کی وجہ سے سارے شہر میں بدنام ہو گئے تھے۔ پھر بہت دنوں کے بعد ان کو خیال آیا کہ روپیوں کا عصا کب کا ٹوٹ چکا ہے۔ بوڑھاپے کی سوکھی ہڈیوں کو نرم نرم جسم کی ضرورت ہے۔

اب نہ تو چاند بائی اس فکر میں تھی کہ بانکے لال کا دل میرا پازیب بن کے رہ جائے۔ نہ بانکے لال اس فکر میں مبتلا تھا کہ وہ چاند بائی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب پی جائے۔ وہ ایک دوسرے کو پھانس لینا چاہتے تھے...... پھر...... وہ ایک لیبل کے تحت خاوند اور بیوی بن گئے۔

بانکے لال کو شہر کی فضا راس نہیں آئی۔ کچھ لوگوں کے تیر و نشتر نے اس کے سینے کو چھلنی کر دیا۔ وہ جانتا تھا اگر کچھ دن اور وہ شہر میں رہے گا تو دل کام کرنا بند کر دے گا۔

وہ چاند بائی کے ساتھ شاداب گاؤں کے موسیٰ محلہ کے خونی بنگلہ میں آ گیا۔ لوگ کہتے رہے کہ بانکے لال پر کوئی مصیبت آ پڑے گی۔ مگر وہ مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک دن

بانکے لال کے خونی بنگلہ سے ایک چیخ سنی گئی۔لوگ دوڑے دوڑے گئے یہ سوچ کر کہ آج کسی آفت نے بانکے لال کو کھالیا۔لیکن وہاں ایک خوبصورت بچی نے ان کا استقبال کیا۔لوگ ایک دوسرے کا منھ تکتے رہ گئے۔

بہت دنوں تک بانکے لال اپنے ماضی کے سیاہ پردے میں چھپا رہا۔ مگر کب تک.....؟ پھر جن کی نگاہیں تیز ہوں وہ بات کو جانے بغیر دم نہیں لیتے

پھر ہر زبان پر یہ بات آگئی۔

''بانکے لال اوباش رہا ہے اور چاند بائی کسی زمانے میں مشہور طوائف تھی۔''

چند دنوں کے لیے گاؤں والوں نے بانکے لال کا حقہ پانی بھی بند کیا۔لیکن وقت اپنا کام کرتا رہا۔لوگ چند دنوں کے بعد سب باتوں کو بھول گئے۔

بانکے لال نے گاؤں میں کیرانا کی ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی۔اس کی بیٹی نینا جب چھ سال کی ہوئی تو اس کو گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کر دیا۔

نینا بڑی شوخ اور تیز لڑکی تھی۔اپنی بات منوانے کے لیے لاکھ حربے استعمال کرتی۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی ندی تھی۔وہ چاروں پہر اس ندی کے پاس رہتی۔ ماں اکثر ڈانٹ کر کہتی۔

''اگر ڈوب جاؤ گی تو مر جاؤ گی۔''

''کیا کروں ماں مجھے پانی کی گود میں رہتے ہوئے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔''

چاند بائی کو نینا کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ نینا ایک آگ کا دریا تھی۔جس کی نس نس سے حرارت پھوٹتی تھی۔

سات سال کا رمیش شرمیلا لڑکا تھا۔اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔وہ کلاس میں الگ بیٹھتا۔اپنے کام سے کام رکھتا۔لیکن نینا کو رمیش کی خاموشی پسند نہیں تھی۔ایک دن اس نے رمیش سے کہا۔

''تم میرے دوست بن جاؤ۔''

رمیش نے شرماتے ہوئے کہا۔

"... کی ہو۔"

"کیا ہوا؟"

رمیش نے پھر سوال کیا۔

"تو کچھ نہیں ہوا۔"

"کچھ نہیں ہوا۔"

تب سے رمیش اور نینا دوست بن گئے۔ اکثر ندی میں اکٹھے نہاتے۔ ایک دوسرے کو ڈبوتے اور پانی پھینکنے کا کھیل کھیلا کرتے۔ ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ دونوں اسکول سے واپس گھر آرہے تھے۔ نینا جب اپنے گھر کے پاس پہنچی تو رمیش سے کہا۔

"اچھا رمیش۔"

پھر جھٹ سے نینا نے رمیش کا منہ چوم لیا اور گھر کے اندر بھاگ گئی۔ رمیش بے بس ہکا بکا دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

چاند بائی نے نینا کی یہ حرکت کھڑکی سے دیکھ لی۔ پہلے تو اس نے نینا کے چھوٹے چہرے پر اپنے بڑے بڑے ہاتھ سے دو تین تھپڑ رسید کیے۔ پھر کہا۔

"میں جس دلدل سے بھاگ آئی تو شاید اسی دلدل میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔"

اس دن کے بعد نینا اسکول نہیں گئی۔

وقت کی ہوا چلتی رہی۔ نینا چار دیواری میں قید ہوگئی۔ پھر چند سالوں کے بعد ندی تک برتن دھونے کی اجازت مل گئی۔

سولہویں سال کی عمر میں پہلی بار نینا کو محسوس ہوا کہ وہ ایک مضبوط قید میں بند ہے۔ اس کی ہر حرکت پر نگاہ ہے۔ وہ شدید کشمکش میں پڑ گئی۔

اس دن جب پہلی بار موہن اس کے گھر آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

موہن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کے پتاجی نے الائچیوں کا یہ پیکٹ دینے کو کہا ہے۔"

پیکٹ دیتے ہوئے موہن کا کھردار ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھو گیا۔اس نے کہا۔

''کل شام چھ بجے میں کھنڈروں کے پاس انتظار کروں گا''

موہن چلا گیا مگر اس کا سانولا رنگ اور چہرے کے کھردرے نقوش بہت دیر تک ذہن میں گھومتے رہے۔موہن میں نینا نے کشش پائی۔اس کے ہاتھوں میں بڑی گرمی تھی۔ایک ایسی گرمی جو دل کو سکون اور دماغ کو فرحت عطا کرتی ہے۔

وہ کچھ وقت کے لیے الجھن کا شکار رہی۔شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جذبات کا دھارا کب کا ٹوٹ چکا تھا۔ذہن جذبات کا غلام بن گیا۔

وہ چھ بجے کھنڈروں میں نظر آئی۔موہن نے اس سے کہا۔

''نینا میں تم کو بہت چاہتا ہوں۔بہت دنوں سے ندی پر آتے جاتے دیکھتا ہوں۔لیکن آج تک کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔جب تمہارے پتا جی نے کہا کہ الائچی کا پیکٹ گھر دے دو تو مجھے اپنا کام بنتا ہوا نظر آیا۔میں جانتا ہوں۔تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔مجھے چاہتی ہو۔کیونکہ تمہارا یہاں آنا ہی اس کی شہادت ہے۔'' وہ بہت دیر بہت کچھ کہتا رہا۔وہ سنتی رہی۔پھر اس کو محسوس ہوا کہ وہ خود بخود اس کے قریب ہوتی گئی۔عہد و پیمان کی ایک لمبی زنجیر بن گئی۔جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا گیا موہن نے کہا۔

''پھر کل آنا۔''

''نہ آؤں۔''

''پھر کبھی نہ آؤں گا۔''

وہ سوچتی رہی۔بہت دنوں تک نئے حالات میں ڈوبی رہی۔وہ ملاقاتیں اب تو اس کے لیے کھانے کی طرح ضروری ہوگئیں۔کبھی ہاتھ سے ہاتھ مل جاتے اور کبھی لب سے لب۔کبھی وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے گلے لگے رہتے۔یہ سب کچھ رات کے اندھیرے میں کھنڈروں میں ہوتا تھا۔

پھر ایک ایسی رات آگئی جب موہن نے یہ فیصلہ کیا کہ آج مجھے وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے۔جس کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں۔ساڑی تو گر گئی۔مگر اس بھیانک آواز نے نینا

کے سہارے جسم کو بے حس کر دیا۔ وہ اس کے والد کی آواز تھی۔ وہ دوڑی دوڑی گھر کے اوپر والے کمرے میں چھپ گئی۔ مگر والد کی تھپڑوں سے نہ بچ سکی۔ تھک ہار کر اس کے والد نے چاند بائی سے کہا۔

''چاند..... میری بیٹی نے مجھے لوٹ لیا۔ میرے ارمانوں کو قتل کر دیا۔ پارسائی کی تصویر کو توڑ دیا۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں برسوں سے بیمار ہوں۔''

بانکے لال چند دنوں تک بخار میں مبتلا رہا۔ واقعی وہ اب صحتمند بانکے لال نہ رہا۔ نینا سے والدین نے بات کرنی بھی چھوڑ دی۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ مگر جب بانکے پہلی بار عصا کے سہارے اٹھا اس نے چاند بائی سے کہا۔

''سورداس کے گھر جاتا ہوں۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔''

سورداس نے اس کو دیکھ کر کہا۔

''بانکے کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''بہت مدت کے بعد ایک بات یاد آ گئی۔''

''آدمی بہت کچھ بھول جاتا ہے۔''

''سورداس میں یہ نہیں بھولا کہ میری ایک لڑکی ہے۔ سورداس مجھے موہن کو دے دو۔ میری نینا تمہاری بیٹی ہو جائے گی۔''

سورداس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''بانکے تمہاری بگڑتی ہوئی صحت کے ساتھ تمہاری عقل بھی بگڑ گئی ہے۔ تم شاید یہ بھول گئے کہ تم اور تمہاری بیوی اپنے ساتھ کوئی ماضی رکھتے ہو۔ ایسے آدمیوں کو اسی زمرے کے لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیے۔''

بانکے نے جھولی بھی پھیلائی۔ مگر خالی واپس لوٹا۔ گھر پہنچا تو اس کے ہاتھوں سے عصا چھوٹ گیا۔ چاند بائی نے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''تمہاری بیٹی تمہارے گھر میں رہے گی۔''

وہ بیٹھ گیا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

''چاند میرے دل کو کچھ ہوا ہے۔ شاید مجھے مرنا ہے۔''

دل اب بوجھ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ زندگی اب مجبوری [illegible] گلے لگ رہی تھی۔

چاند بائی رو رہی تھی۔ نینا باپ کے سرہانے کھڑی تھی۔ [illegible] لیکن مرض لاعلاج تھا۔ بانکے لال نینا سے کہہ رہا تھا۔

''نینا میری بیٹی مجھے افسوس ہے کہ تم کو ایک مطمئن اور سکون بھرا جیون نہ دے سکا۔ تمھیں میرا ماضی بہت ستائے گا۔''

بانکے لال چاند بائی کو روتے ہوئے چھوڑ گیا۔ نینا اس کے سرہانے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح کھڑی تھی۔

مرنے والے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جو باقی رہتے ہیں وہ آنے والے دنوں کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ ان کے لیے خیال سہارا بن جاتا ہے۔ چاند بائی کے لیے یہ خیال سہارا بن گیا کہ کوئی نہ کوئی اس کی بیٹی کا ہاتھ تھامنے والا ہوگا۔

ایک دن ایسا آدمی آ گیا۔ اس نے چاند بائی سے کہا۔

''کیا ہوا جو آدمی تھوڑا سا عمر میں بڑا ہے۔ پہلی بیوی مر گئی ہے۔ اس بیوی کے دو بیٹے ہیں۔ لیکن امیر ہے امیر۔ دولت کی دیوی اس پر مہربان ہے۔ ایسے رشتے روز روز نہیں آتے۔ پھر کچھ اپنے ماضی کا بھی خیال کرو۔''

چاند بائی کے لیے راستہ بند تھا۔ اقرار میں سر ہلانا پڑا۔ شادی کے لیے ہری لال کے پیسے آئے۔ چاند بائی کے ہاتھوں کوئی دو لاکھ روپئے لگ گئے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چلو اچھا ہوا۔ ایک تو بیٹی پر کوئی پیسہ خرچ نہ ہوا اور اوپر سے دو لاکھ ہاتھ آئے۔

بارات آئی، شہنائی بجی تب ہری لال کا ساٹھ سالہ لٹکا ہوا چہرہ نظر آیا۔

چاند بائی نے بیچ والے آدمی کو پکڑا۔

بوڑھا ہے۔"

چپ کرو چاند بائی..... چپ کرو۔ تمہیں اپنے ماضی پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جہاں تمہاری پازیب کی جھنکار پر رنگ برنگے نوٹ ملتے تھے۔ وہ نوٹ آج تمہارے گلے کی پھانسی ہیں۔"

وہ خاموش ہوگئی اور پھول جیسی نینا کو ہری لال کے حوالے کر دیا۔ اب نینا کے پاس صبر کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ہری لال کی حویلی بہت بڑی ضرور تھی مگر خاموشی کا ایک غار تھی۔ جہاں دو بوڑھے نوکر تھے۔ ان بوڑھوں میں ایک جوانی بے بس تھی۔

نینا نے سوچا ہری لال بوڑھا ہے اس کے ارمان بوڑھے تھے۔ شاید اس کے جذبات میں اب بھی گرمی ہو۔ شاید اب بھی اس کا دل حرارت رکھتا ہو۔ اگر چہ اس کے ناتواں ہاتھوں میں کپکپاہٹ نینا کو صاف نظر آرہی تھی۔ لیکن جذبات کا عمل کچھ اور تھا۔

ہری لال نے اپنی نئی دولہن کا گھونگھٹ اٹھایا۔ پھر اپنے بوسیدہ ہونٹ اس کے سرخ دہکتے ہوئے ہونٹوں سے ملا دیے۔ اس کے ہونٹ جل گئے۔ دلہن اس کے بوڑھے سینے سے چپک جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ نوکیلی ہڈیاں اس کے نرم نرم گوشت کو ملستی تھیں۔

جب تین گھنٹے بیت گئے تو اس کو معلوم ہوا۔ وہاں صرف جذبات تھے۔ عمل نہیں تب وہ رات کے آخری پہر بازو پھیلائے ہوئے خدا کو کوسنے لگی۔ وقت نے رفتار پکڑ لی۔ نینا اپنے کچلے ہوئے جذباتوں کے تلے دب گئی۔ خواہشات مردہ ہوگئے۔ زندگی ایک پھیکی تصویر بن گئی۔ ہری لال نے ایک دن نینا سے کہا۔

"صبح میرا وکیل بیٹا آرہا ہے۔"

نینا نے ماں کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کرے وہ اچھا ہو۔"

ہری لال نے کہا۔

"اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے۔ میں اس بنگالی لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کے خلاف تھا۔ مگر تمہارے آنے کے بعد میرے خیالوں میں تبدیلی آگئی۔ میں نے اس کو بلا

لیا۔"

"بہت اچھا جو بیٹا واپس آئے۔"

ہری لال دوسرے دن اپنی بیل گاڑی میں وکیل بیٹے اور ا[illegible] لایا۔

شیکھر نے اپنے باپ سے کہا۔

"پتا جی باغوں کا کام کیسا ہے۔"

"اب تم آگئے ہو تو خود ہی سنبھالو گے۔"

شیکھر کی بیوی رادھا نے کہا "شیکھر شاید تم وکالت چھوڑ کے کسانوں کا کام نہیں کرو گے۔"

"ہاں ایسا ممکن تو نہیں ہے۔"

ہری لال کا چہرہ لٹک گیا۔ نینا نے ممتا بھری آواز میں شیکھر سے کہا۔

"کیسے ہو بیٹے؟"

شیکھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم شاید میری نئی ماں ہو۔"

"شاید نہیں، ہوں۔" نینا نے اپنے حق پر زور دیا۔

رادھا نے شیکھر کے کان میں کہا۔

"ناگن ہے ناگن۔ اس نے تمہارے باپ کو پھانس لیا۔ تم بچ کے رہنا۔"

شیکھر نے اونچی آواز میں کہا۔

"کیا ہوا تم کو؟"

رادھا کا سر جھک گیا۔

حویلی ضرور حویلی تھی مگر اس میں رہنے والوں کے دل حویلی نہیں تھے۔ رادھا اکھڑی اکھڑی رہتی۔ شیکھر اپنی ماں کی جگہ کسی دوسری عورت کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

نینا میاں بیوی کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر اپنے تن بدن میں آگ محسوس کر رہی تھی۔ وہ جذبات جو عرصہ سے مردہ پڑے تھے، زندہ ہو گئے۔ اس کی کچلی ہوئی خواہشوں میں پھر جوانی

آ گئی [illegible] روح نے روند دی تھی۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور وارفتگی کے عالم میں آدمی



کچھ بھی [illegible] سکتا ہے۔ اپنے تشنہ جذبات کی پیاس کسی بھی طریقے سے بجھا سکتا ہے۔ ایک رات کو وہ شیکھر کے دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ جہاں سے شیکھر اور رادھا کی سانسیں اس کے دماغ کو فرحت عطا کرتی تھیں۔

ان کی جذباتی باتوں سے وہ مسرت کے گہوارے میں ڈوب جاتی پھر یہ کھیل دیکھنا اس کا روزانہ کا معمول بن گیا۔ ایک دن وہ رادھا کے ہاتھوں پکڑی گئی۔

''ماں جی یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

نینا چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خاموشی کے ساتھ سو گئی۔ مگر دوسرے دن جب آنکھ کھولی تو معلوم ہوا رادھا اور شیکھر کلکتہ واپس جا رہے ہیں۔

نینا نے شیکھر سے کہا۔

''تم جا رہے ہو۔''

''میں وکیل ہوں۔ میرا کام شہر میں ہے۔ اس لیے میں واپس جا رہا ہوں۔''

اس دن اس نے پھر سارا وقت بستر میں نیند کے حوالے کیا۔

شیکھر چلا گیا۔ بہت دنوں تک نینا کے کانوں میں اس کی سانسیں سرگوشیاں کرتی رہیں۔ مگر کچلے جذبات کو تقویت نہیں پہنچ سکی۔ اس تپش میں نینا جلتی رہتی اور کبھی کبھی اپنے گرم جسم کو گھنٹوں نہاتے ہوئے سرد کرتی۔

ایک صبح ہری لال کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

''مبارک ہو نینا، تمہارا بیٹا برج یونیورسٹی میں فرسٹ آیا۔ وہ پرسوں آ رہا ہے۔''

نینا کے لیے یہ خبر مسرت بھری تھی۔ برج کے کمرے کی ہر چیز خود اس نے اپنے ہاتھوں سے صاف کی جیسے ان پر اپنی چھاپ چڑھا لینا چاہتی ہو۔

تیسری صبح اس کے سامنے برج کھڑا تھا۔

''برج کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔ آپ کیسی ہیں۔''

"میں بھی اچھی ہوں۔"

برج کے کھانے کی، اس کے کپڑے کی، اس کے جوتوں کی، یہاں تک کہ اس کی ہر ہدایت کا وہ خیال رکھتی۔ وہ خود اپنے ہاتھوں اس کا سارا کام کرتی۔

برج نے ایک دن اس سے کہا۔

"تم میرا بہت خیال رکھتی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم عمر کی بہت چھوٹی ہو۔ پھر کیسے میرے باپ سے رشتہ جوڑ لیا۔ مجھے یہ رشتہ دیکھ کر بڑی کوفت ہو رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کس مجبوری نے تمہیں اپنا جیون برباد کرنے کے لیے مجبور کیا۔"

"قسمت کی بات ہے۔"

"آدمی ہر بری بات کو قسمت کہتا ہے۔ مجھے واقعی افسوس ہو رہا ہے۔"

"تم مجھے نینا کہا کرو۔"

برج اس کو بہت دیر تک حیرانی سے تکتا رہا۔ پھر ایک دن جب برج کو سر درد تھا نینا اس کا سر دباتی رہی۔ برج نے کہا۔

"تمہارے پھول سے ہاتھوں میں کوئی جادو ہے۔ درد اب بہت ہلکا ہو گیا۔"

نینا نے اپنے دہکتے ہوئے ہونٹوں کو اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے اچھے برج"

اس کے ہونٹوں کے لمس نے برج کی سارے بدن میں برقی لہر دوڑائی۔ وہ بہت دیر تک نینا کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر ایک آہ بھرتے ہوئے خود سے کہا۔

"ایک اچھی لڑکی کی زندگی برباد ہو گئی ہے۔"

ایک رات بڑے زوروں کی ہوا چلی۔ کالے بادل گرج پڑے۔ بجلیاں چمک اٹھیں۔ آدھی رات کے وقت نینا کو برج کا خیال آیا۔ اس نے سوچا۔

"کہیں برج ڈرتا تو نہیں ہوگا۔"

وہ دوڑی دوڑی اس کے کمرے میں آ گئی۔ برج نیند میں مست پڑا تھا۔ اس نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ برج نے آنکھیں کھولیں۔

''اچھے ہو برج۔''

برج نے سوچا وہ شاید کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر ساڑی کا پلوگرا کے نینا جوانی کا اعلان کر رہی تھی۔ اس نے نینا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بے ترتیب سانسوں میں کہا۔

''تم میری ہو۔''

نینا نے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں ...... میں تمہاری ہوں۔''

پھر اس رات کے کالے بادل اور نہ ہی بجلیاں ان کے ارادوں میں حائل ہوئے۔

نینا عورت بن گئی۔ اس کے ارمانوں میں بہار آ گئی۔ وہ خود کو ہوا میں چلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس نے برج سے کہا۔

''آؤ برج کہیں بھاگ جائیں۔''

برج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہم بھاگ سکتے ہیں۔ مگر نہیں بھاگیں گے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کے قربت کے بغیر پیاسا محسوس کرتے۔ رشتوں نے ضمیر کو بہت عرصے تک جھانسے میں رکھا۔

ہری لال اپنے باغوں اور کھیتوں میں مصروف تھا۔ پیچھے کیا ہوا، اور کیا ہو رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

پھر اچانک اس کی بوڑھی ناک نے کچھ سونگھنا شروع کیا۔ ایک دوپہر ہری لال چپکے سے برج کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں نینا اور برج کو محو بوسہ پایا۔ بوڑھا ٹوٹ گیا۔ اس نے کہا۔

''برج''

برج اور نینا کو ہوش آیا۔

اچانک وہ چیخ پڑا۔

"لعنت ہو تم پر۔ تم میرے بیٹے ہو...... نہیں..... نہیں۔ تمہاری رگوں میں میرا خون نہیں۔ تم کمینے ہو۔ تم ذلیل ہو۔"

برج تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا۔ پھر سنجیدہ آواز میں بولا

"پتا جی کون ذلیل ہے؟ کون کمینہ ہے؟ کوئی نہیں کہہ سکتا [illegible] لڑکی کی زندگی برباد کی۔ میں نے اس کو خوشی دی۔ زندگی دی۔"

"تم نے ماں کے رشتے پر حملہ کیا۔"

"پتا جی رشتے ہم خود ترتیب دیتے ہیں۔"

بوڑھا اس کے بعد کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اپنے باغوں اور کھیتوں میں نہیں گیا۔ وہ حویلی واپس نہیں آیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ اس کے بوڑھے پاؤں کہاں کہاں گئے۔

برج نے نینا سے کہا۔

"پتا جی ہم سے دور چلے گئے۔ یہ ہم نے اچھا نہ کیا۔"

"لیکن انہوں نے اپنے لیے ضرور اچھا کیا۔"

"اب اس گاؤں میں ہمارا رہنا ٹھیک نہیں۔"

"ہاں یہاں سے دور جانا ہوگا۔"

پختہ تارکول کی سڑک تھی اس کے ایک طرف خونی بنگلہ اور خونی بنگلے کے سامنے ایک بھکاری جس کی داڑھی بہت لمبی تھی۔ جس کے ہاتھ پر کوئی کچھ رکھ کے چلا جاتا تھا۔

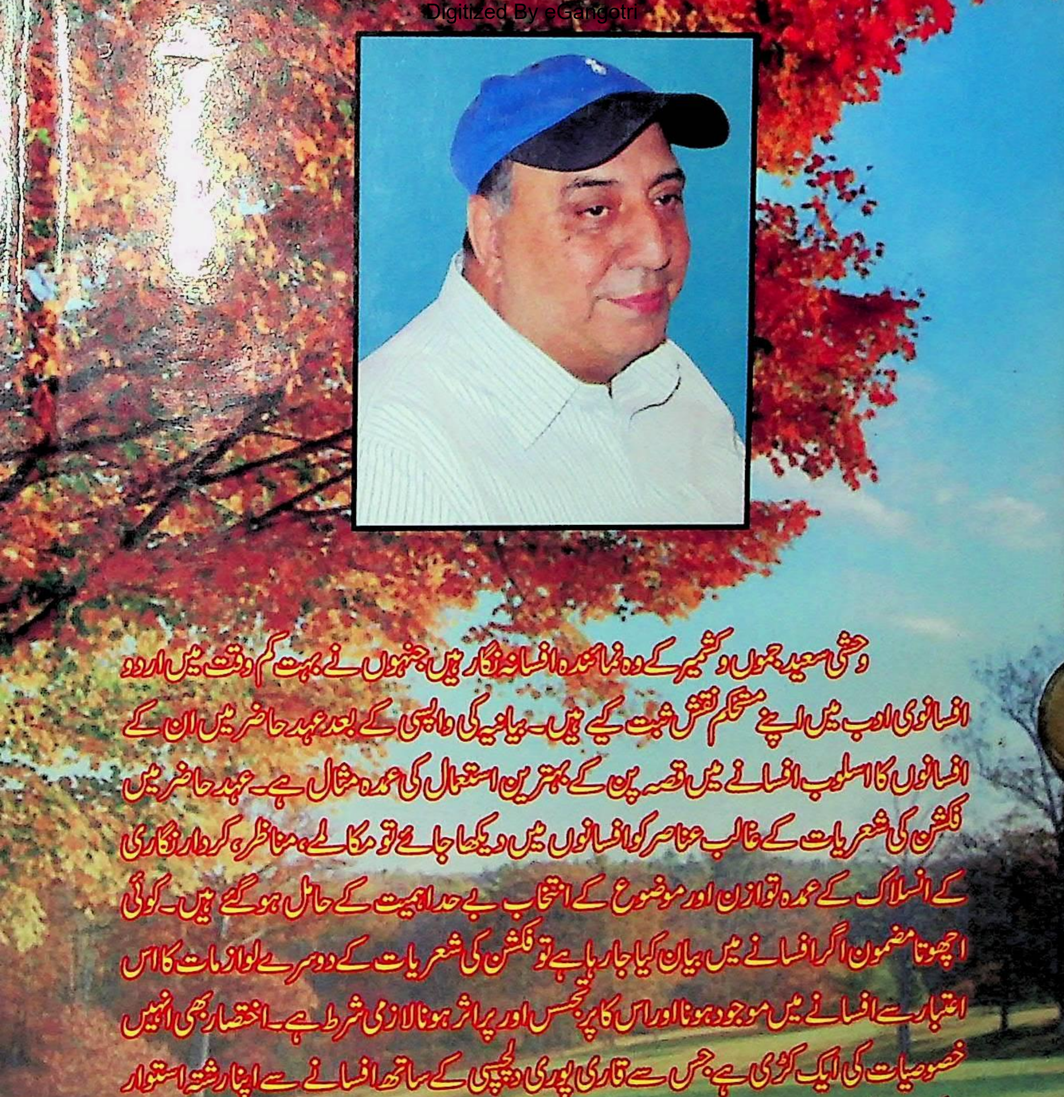
برج اور نینا میاں بیوی بن کے خونی بنگلے میں رہنے آ گئے۔ انہوں نے بھکاری کے ہاتھ میں بیس روپے رکھ دیے۔ بھکاری نے کہا۔

"تمہاری جوڑی بنی رہے۔"

مگر جب بھکاری کی نگاہوں نے ان کو دیکھا۔

"تم"

مگر وہ آواز ابھر نہ سکی۔ بوڑھے کی زندگی صلیب پر چڑھ گئی۔



وحشی سعید جموں وکشمیر کے وہ نمائندہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے بہت کم وقت میں اردو افسانوی ادب میں اپنے مستحکم نقش ثبت کیے ہیں۔ بیانیہ کی واپسی کے بعد عہد حاضر میں ان کے افسانوں کا اسلوب افسانے میں قصہ پن کے بہترین استعمال کی عمدہ مثال ہے۔ عہد حاضر میں فکشن کی شعریات کے غالب عناصر کو افسانوں میں دیکھا جائے تو مکالمے، مناظر، کردار نگاری کے انسلاک کے عمدہ توازن اور موضوع کے انتخاب بے حد اہمیت کے حامل ہو گئے ہیں۔ کوئی اچھوتا مضمون اگر افسانے میں بیان کیا جارہا ہے تو فکشن کی شعریات کے دوسرے لوازمات کا اس اعتبار سے افسانے میں موجود ہونا اور اس کا پر تجسس اور پر اثر ہونا لازمی شرط ہے۔ اختصار بھی انہیں خصوصیات کی ایک کڑی ہے جس سے قاری پوری دلچسپی کے ساتھ افسانے سے اپنا رشتہ استوار رکھے۔ وحشی سعید کے تقریباً تمام ہی افسانوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

جاوید انور

**Tahreek-e-Adab**
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.) INDIA
Cell: 0091 - 993-595-7330
e-mail: jaweanwar@gmail.com